ساز نو

کتابی دنیا

مجاز

ساز نو

اسرار الحق مجاز

جنوری ۱۹۴۹ء تک کا تمام کلام

کتابی دنیا لکھنؤ

قیمت ..... ڈھائی روپے

نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے "کتابی دنیا" لکھنؤ کیلئے شائع کیا

مطبوعہ یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ

کیا ہوا؟

سبزہ و برگ و لالۂ و سرو سمن کو کیا ہوا
رنگ چمن پریدہ ہے رقصِ چمن کو کیا ہوا
بوئے چمن رواں دواں غنچہ و گل دھواں دھواں
خلدِ وطن کے پاسباں خلدِ وطن کو کیا ہوا

بند ہے راہ ناز کی گم ہیں صدائیں ساز کی
عشوہ دل نواز کی رسم کہن کو کیا ہوا
جس کی نوائے دلستاں نغمۂ ساز شوق تھی
کوئی بتاؤ اس بت غنچہ دہن کو کیا ہوا
چشمک دم بدم نہیں مشقِ خرام و رم نہیں
مرے غزال کیا ہوئے مرے ختن کو کیا ہوا
عشق کا ساز اتر گیا حسن کا راگ مر گیا
وائے وہ نل کدھر گیا، ہائے دمن کو کیا ہوا
دیدہ شوق اشک بار، ذوق نگاہ سرنگوں
عصر رواں کی لیلیٰ پردہ فگن کو کیا ہوا
جسمِ حسین مہوشاں اور لباسِ خونچکاں
ہند کے مرد تو ہی کہہ ہند کی زن کو کیا ہوا

آہ خرد کدھر گئی، آہ جنوں نے کیا کیا
آہ شبابِ خوگرِ دار و رسن کو کیا ہوا

کوئی بتائے عظمتِ خاکِ وطن کہاں ہے اب
کوئی بتائے غیرتِ اہلِ وطن کو کیا ہوا

کوہ وہی، دمن وہی، دشت وہی چمن وہی
پھر یہ مجاز جذبۂ حُبِّ وطن کو کیا ہوا

"فکر"

نہیں ہر چند کسی گم شدہ جنت کی تلاش
اک نہ اک خلدِ طرب ناک کا ارماں ہے ضرور
بزمِ دوشینہ کی حسرت تو نہیں ہے مجھ کو
مری نظروں میں کوئی اور شبستاں ہے ضرور

(۲)

مٹ کے برباد جہاں ہو کے سبھی کچھ کھو کے
بات کیا ہے کہ زیاں کا کوئی احساس نہیں
کارفرما ہے کوئی تازہ جنونِ تعمیر
دلِ مضطر ابھی آماجگہ یاس نہیں

۳

تازہ دم بھی ہوں مگر پھر یہ تقاضا کیوں ہے
ہاتھ رکھ دے مرے ماتھے پہ کوئی زہرہ جبیں
ایک آغوشِ حسیں شوق کی معراج ہے کیا
کیا یہی ہے اثر نالہ دلہائے حزیں

۴

مہوشوں کا طرب انگیز تبسم کیا ہے
ہے تو سب کچھ، یہ مگر خراب اثر کیوں ہو جائے
حسن کی جلوہ گہِ ناز کا افسوں تسلیم
یہی قربان گہِ اہل نظر کیوں ہو جائے

۵

میں نے سوچا تھا کہ دشوار ہے منزل اپنی
اک حسیں بازوے سیمیں کا سہارا بھی تو ہو

دشتِ ظلمات سے آخر کو گزرنا ہے مجھے
کوئی رخشندہ و تابندہ ستارہ بھی تو ہو

۶

آگ کو کس نے گلستاں نہ بنانا چاہا
جل بجھے کتنے خلیل آگ گلستاں نہ بنی
ٹوٹ جانا درِ زنداں کا تو دشوار نہ تھا
خود زلیخا ہی رفیقِ مہِ کنعاں نہ بنی

۷

بہ ایں انعامِ وفا، اف یہ تقاضائے حیات
زندگی وقفِ غمِ خاک نشیناں کر دے
خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خونِ دل نذرِ چمن بندیٔ دوراں کر دے

آج بھی

میں ہوں مجازؔ آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں!
شاعرِ محفلِ وفا، مُطربِ بزمِ دلبراں
آج بھی خار زارِ غم خلد بریں مرے لئے
آج بھی رہ گذارِ عشق میرے لئے ہے کہکشاں
آج بھی گا رہا ہوں میں سازِ جنوں لئے ہوئے
سوزِ نہاں سے آج بھی رُوح تپاں ہے دل تپاں
آج بھی زندگی مری غرقِ شرابِ تند و تیز
آج بھی ہاتھ میں مرے جامِ شرابِ ارغواں

آج بھی ہے رچی ہوئی آج بھی ہے بسی ہوئی
میرے نفس میں خُلد کی نزہت و نکہتِ جواں
آج بھی نکتہ چیں ہوں میں خلوتیانِ خاص کا
خلوتیانِ خاص کا آج بھی ہوں مزاج داں
آج بھی اشکِ خوں مرا قشقہ جبینِ ناز کا
آج بھی خاکِ دل مری سرمۂ چشم گلرخاں
آج بھی ہے زباں مری خنجر بے نیامِ شوق
بحث طلب ہی آج بھی جرأت و شوخی بیاں
آج بھی دل کو ہے مرے دولتِ آگہی نصیب
آج بھی ہے نظر مری ارض و سما کی رازداں
آج بھی ہے جنوں مرا دیر و حرم پہ خندہ زن
آج بھی مجھ سے بدحواس دیر و حرم کے پاسباں

آج بھی سازِ مرے گرمیٔ بزمِ سرکشی
آج بھی آتشِ سخن شعلہ فشاں شرر فشاں
آج بھی ہے لکھی ہوئی سُرخ حروف میں مجازؔ
دفترِ شہریار میں میرے جنوں کی داستاں

شہرِ نگار

رخصت اے ہمسفر و شہرِ نگار آہی گیا
خلد بھی جس پہ ہو قربان وہ دیار آہی گیا
یہ جنوں زار مرا، میرے غزالوں کا جہاں
میرا نجد آہی گیا، میرا تتار آہی گیا
آج پھرتا بہ چمن در پئے گلہائے چمن
گنگناتا ہوا زنبورِ بہار آہی گیا

گیسوؤں والوں میں، ابرو کے کماندار و نمیں
ایک صید آہی گیا، ایک شکار آہی گیا
باغبانوں کو بتاؤ، گل و نسریں سے کہو
اک خراب گل و نسرینِ بہار آہی گیا

خیر مقدم کو مرے کوئی بہ ہنگام سحرا
اپنی آنکھوں میں لئے شب کا خمار آہی گیا
زلف کا ابر سیہ باندھے سیمیں پہ لئے
پھر کوئی زخمہ زنِ سازِ بہار آہی گیا
ہو گئی تشنہ لبی آج رہینِ کوثر
میرے لب پر لب لعلینِ نگار آہی گیا

عشرتِ تنہائی

میں کہ میخانۂ اُلفت کا پُرانا میخوار!
محفلِ حسن کا اک مُطربِ شیریں گفتار
ماہ پاروں کا ہدف، زہرہ جبینوں کا شکار
نغمہ پیرا و نوا سنج و غزلخواں ہوں میں
کتنے دل کش مرے بتخانۂ ایماں کے صنم
وہ کلیساؤں کے آہو، وہ غزالانِ حرم
میں ہمہ شوق و محبت، وہ ہمہ لطف و کرم
مرکزِ مرحمتِ محفلِ خوباں ہوں میں

موجزن ہے مئے عشرت مرے پیمانوں میں
یاس کا درد ہے کم تر مرے افسانوں میں
کامرانی ہے پرافشاں مرے رومانوں میں
یاس کی سعیٔ جنوں خیز پہ خنداں ہوں میں

میرے افکار میں مہتاب کی طلعت غلطاں
میری گفتار میں ہے صبح کی نزہت غلطاں
میرے اشعار میں ہے پھولوں کی نکہت غلطاں
روحِ گلزار ہوں میں جانِ گلستاں ہوں میں

لاکھ مجبور ہوں میں ذوقِ خود آرائی سے
دل ہے بیزار اب اس عشرتِ تنہائی سے
آنکھ مجبور نہیں ہے مری بینائی سے
محرمِ درد و غمِ عالمِ انساں ہوں میں

یہی نہ چاہوں کہ ہر اک ہاتھ میں پیمانہ ہو
یاس و محرومی و مجبوری اک افسانہ ہو
عام اب فیضِ مئے و ساقی و مے خانہ ہو
رند ہوں اور جگر گوشۂ رنداں ہوں میں

اب یہ ارمان کہ بدل جائے جہاں کا دستور
ایک اک آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور
ایک اک جسم پہ ہو اطلس و کمخواب و سمور
اب یہ بات اور ہے خود چاک گریباں ہوں میں

عیادت

یہ کون آگیا رُخِ خنداں لئے ہوئے
عارض پہ رنگ و نُور کا طوفاں لئے ہوئے
بیمار کے قریب بصد شانِ احتیاط
دلداریٔ نسیمِ بہاراں لئے ہوئے
رُخسار پر لطیف سی اک موجِ سرخوشی
لب پر ہنسی کا نرم سا طوفاں لئے ہوئے
پیشانیٔ جمیل پہ انوارِ تمکنت
تابندگیٔ صبحِ درخشاں لئے ہوئے

زلفوں کے پیچ و خم میں بہاریں چھپی ہوئی
اک کاروانِ نکہتِ بستاں لئے ہوئے
آ ہی گیا وہ میرا نگارِ نظر نواز
ظلمت کدے میں شمع فروزاں لئے ہوئے
اک اک ادا میں سینکڑوں پہلوئے دلدہی
اک اک نظر میں پرسشِ پنہاں لئے ہوئے
میرے سوادِ شوق کا خورشیدِ نیم شب
عزمِ شکستِ ماہ جبیناں لئے ہوئے
درسِ سکون و صبر بہ ایں اہتمامِ ناز
نشتر زنیٔ جنبشِ مژگاں لئے ہوئے
آنکھوں سے ایک رَو سی نکلتی ہوئی ہر آن
غرقابیٔ حیات کا ساماں لئے ہوئے

ملتی ہوئی نگاہ میں تجلی بھری ہوئی
کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لئے ہوئے
یہ کون ہے حجاز سے سرگرمِ گفتگو
دونوں ہتھیلیوں پہ زنخداں لئے ہوئے

قطعہ

جوانی کی نگاہیں پیاو کیفی ہیں عین مستی ہیں
اجل کا وحشیانہ رقص ہو رقصِ نگاہ ہستی میں
ضعیفی محفل عشرت سے خرقہ بہ پیش آئی ہے
جوانی جب بھی آئی ہے کفن بردوش آئی ہے

اعتراف

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو؟
میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو، فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اُتر آئی ہو
مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے

خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہرِ خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خوابگاہوں میں لٹائی ہے جوانی میں نے

حُسن نے سامنے وہ لعل و گہر ڈال دیئے
میرے پیمانِ محبّت نے سپر ڈال دیئے

اندنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا
سر پہ سرشاریٔ عشرت کا جنوں طاری تھا
ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری تھا
شہر یاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا

بسترِ مخمل و سنجاب تھی دنیا میری
ایک رنگین و حسین خواب تھی دنیا میری

جنتِ شوق تھی بیگانۂ آفاتِ سموم
درد جب درد نہ ہو۔ کاوشِ درماں معلوم
خاک تھے دیدۂ بیباک میں گردوں کے نجوم
بزم پرویں تھی نگاہوں میں کنیزوں کا ہجوم
لیلیٰ ناز برافگندہ نقاب آتی تھی
اپنی آنکھوں میں لئے دعوتِ خواب آتی تھی
سنگ کو گوہرِ نایاب و گراں جانا تھا
دشتِ پُر خار کو فردوسِ جواں جانا تھا
ریگ کو سلسلۂ آبِ رواں جانا تھا
آہ یہ راز ابھی میں نے کہاں جانا تھا
میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں
ہر مسرت میں ہے رازِ غم و حسرت پنہاں

کیا سنوگی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریادِ جگر دوز، مرا نالۂ زار
شدّتِ کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار

وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

میرے سائے سے ڈرو تم مری قربت سے ڈرو
اپنی جرأت کی قسم اب مری جرأت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو میری محبت سے ڈرو

اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں، ہاں میں وفادار نہیں
اب مرے پاس تم آئی ہو کیا آئی ہو

تعارف

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں — جنسِ الفت کا طلبگار ہوں میں
عشق ہی عشق ہے دُنیا میری — فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
خوابِ عشرت میں ہیں اربابِ خرد — اور اک شاعرِ بیدار ہوں میں
چھیڑتی ہے جسے مضرابِ الم — ساز فطرت کا وہی تار ہوں میں
رنگِ نظارۂ قدرت مجھ سے — جانِ رنگینیِ کہسار ہوں میں
نشۂ نرگسِ خوباں مجھ سے — غازۂ عارض و رخسار ہوں میں
عیب جو حافظؔ و خیامؔ میں تھا — ہاں کچھ اسکا بھی گنہگار ہوں میں
زندگی کیا ہے گناہِ آدم — زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

رشکِ صد ہوش ہے مستی میری — ایسی مستی ہے کہ ہشیار ہوں میں
لے کے نکلا ہوں گہر ہائے سخن — ماہ و انجم کا خریدار ہوں میں
دیر و کعبہ میں مرے ہی چرچے — اور رسوا سرِ بازار ہوں میں
کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے — اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں
اہلِ دنیا کے لئے ننگ سہی — رونقِ انجمنِ یار ہوں میں
عین اس بے سر و سامانی میں — کیا یہ کم ہے کہ گہر بار ہوں میں
میری باتوں میں مسیحائی ہے — لوگ کہتے ہیں کہ بیمار ہوں میں
مجھ سے برہم ہے مزاجِ پیری — مجرمِ شوخیٔ گفتار ہوں میں
حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں — نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں
محفلِ دہر پہ طاری ہے جمود — اور وارفتہ رفتار ہوں میں

اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں
اک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

نذرِ دل

(اُن کے نام)

اپنے دل کو دونوں عالم سے اٹھا سکتا ہوں میں
کیا سمجھتی ہو کہ تم کو بھی بھلا سکتا ہوں میں

کون تم سے چھین سکتا ہے مجھے، کیا وہم ہے
خود زلیخا سے بھی تو دامن بچا سکتا ہوں میں

دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں

دفن کر سکتا ہوں سینے میں تمھارے راز کو
اور تم چاہو تو افسانہ بنا سکتا ہوں میں

میں قسم کھاتا ہوں اپنے نطق کے اعجاز کی
تم کو بزمِ ماہ و انجم میں بٹھا سکتا ہوں میں
سر پہ رکھ سکتا ہوں تاجِ کشورِ نورانیاں
محفلِ خورشید کو نیچا دکھا سکتا ہوں میں
میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہارے واسطے
دل بچھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں
تم اگر روٹھو تو اک تم کو منانے کے لئے
گیت گا سکتا ہوں میں، آنسو بہا سکتا ہوں میں
جذب ہے دل میں مرے دونوں جہاں کا سوز و ساز
بربطِ فطرت کا ہر نغمہ سُنا سکتا ہوں میں
تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیاں
میں یہ کہتا ہوں کہ ہر پردہ اٹھا سکتا ہوں میں

تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوسِ نظر

مجھ کو یہ دعویٰ کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں

آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں

دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

قطعہ

وقت کی سعیِ مسلسل کارگر ہوتی گئی

زندگی لحظہ بلحظہ مختصر ہوتی گئی

سانس کے پردوں میں بجتا ہی رہا سازِ حیات

موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہوتی گئی

مجبوریاں

میں آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا
سکوں لیکن مرے دل کو میسّر آ نہیں سکتا
کوئی نغمے تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے
جو گانا چاہتا ہوں آہ وہ میں گا نہیں سکتا
متاعِ سوز و سازِ زندگی، پیمانہ و بربط
میں خود کو اِن کھلونوں سے بھی اب بہلا نہیں سکتا
وہ بادل سر پہ چھائے ہیں کہ سر سے ہٹ نہیں سکتے
مِلا ہے درد وہ دل کو کہ دل سے جا نہیں سکتا

ہوس کاری ہے جرمِ خودکشی میری شریعت میں
یہ حدِ آخری ہے میں یہاں تک جا نہیں سکتا

نہ طوفاں روک سکتے ہیں نہ آندھی روک سکتی ہے
مگر پھر بھی میں اُس قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا

وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اُس کو پوجتا ہوں اور اُس کو پا نہیں سکتا

یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری
کہ اُس کے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا

زباں پر بیخودی میں نام اُس کا آہی جاتا ہے
اگر پوچھے کوئی، یہ کون ہے؟ بتلا نہیں سکتا

کہاں تک قصۂ آلامِ فرقت مختصر یہ ہے
یہاں وہ آ نہیں سکتی وہاں میں جا نہیں سکتا

حدیں دو کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہونچا نہیں سکتا

قطعہ

یہ کوٹ بھی سفید، یہ پتلون بھی سفید
تیرے سفید، ہیٹ سے بنے کا اون بھی سفید
خود جسم بھی سفید ہے اور اسکے ساتھ ساتھ
میں تو یہ جانتا ہوں ترا خون بھی سفید

ایک دوست کی خوش مذاقی پر

ہو نہیں سکتا تری اس "خوش مذاقی" کا جواب
شام کا دلکش سماں اور تیرے ہاتھوں میں کتاب

رکھ بھی دے اب اس کتابِ خشک کو بالائے طاق
اُڑ رہا ہے رنگ و بُو کی بزم میں تیرا مذاق

چھپ رہا ہے پردۂ مغرب میں مہرِ زر فشاں
دید کے قابل ہیں بادل میں شفق کی سُرخیاں

موجزن جوئے شفق ہے اس طرح زیرِ سحاب
جس طرح رنگین شیشوں میں چھلکتی ہے شراب

اک نگارِ آتشیں ہر شے پہ ہے چھایا ہوا
جیسے عارض پر عروسِ نو کے ہو رنگِ حیا
شانۂ گیتی پہ لہرانے کو ہیں گیسوئے شب
آسماں پر منعقد ہونے کو ہے بزمِ طرب
اُڑ رہے ہیں جستجو میں آشیانوں کے طیور
آ چلا ہے آئینے میں چاند کے ہلکا سا نور

دیکھ کر یہ شام کے نظارہ ہائے دل نشیں
کیا ترے دل میں ذرا بھی گدگدی ہوتی نہیں
کیا تری نظروں کو یہ رنگینیاں بھاتی نہیں
کیا ہوائے سرد تیرے دل کو تڑپاتی نہیں
کیا نہیں ہوتی تجھے محسوس مجھ کو سچ بتا
تیز جھونکوں میں ہوا کے گنگنانے کی صدا

سبزہ و گل دیکھکر تجھ کو خوشی ہوتی نہیں
اُف ترے احساس میں اتنی بھی رنگینی نہیں
حُسنِ فطرت کی لطافت کا جو تو قائل نہیں
میں یہ کہتا ہوں تجھے جینے کا حق حاصل نہیں

قطعہ

یہ مانا آج دل درد و الم سے پارا پارا ہے
بلندی دیکھنے والے کو پستی بھی گوارا ہے
ہزاروں مرحلے میں طے کر چکا ہوں بام گردوں
ہزاروں وہ ہیں جنکو میں نے گردوں سے اتارا ہے

نغمۂ ٹیگور

(ترجمہ از گارڈنر)

میں نے ہنگامِ صبح، اے دنیا ——— تیرے گلشن سے ایک گل توڑا
اپنے سینے پہ دی جگہ اُس کو ——— چُبھ گیا دل میں لیکن اِک کانٹا
شام ہوتے ہی میں نے یہ دیکھا ——— گُل تھا پژمردہ درد باقی تھا
حُسن و خوشبو میں اک سے اک بڑھکر ——— اور بھی ہوں گے تجھ میں گل پیدا
میری گُل چینیوں کا وقت مگر ——— اک مُدت ہوئی کہ ختم ہوا

اور اب جبکہ رات طاری ہے
گل نہیں پاس درد باقی ہے

کس سے محبّت ہے؟

بتاؤں کیا تجھے اے ہمنشیں کس سے محبّت ہے
میں جس دُنیا میں رہتا ہوں وہ اس دُنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بُو ہے پیکرِ حُسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اُس کی

وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثُریا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے، ماہ طلعت ہے
مرا ایماں ہے، میری زندگی ہے، میری جنّت ہے
میری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اُس کی

وہ اک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگِ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھونک سکتی ہے گلستاں کو
وہ بجلی ہے جلا سکتی ہے ساری بزمِ امکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں شرر سامانیاں اُسکی

زباں پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اِس دُنیا سے اکثر اس قدر آگے
مری تخئیل کے بازو بھی اُس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اُس کی

جبیں پر سایہ گستر پرتوِ قندیلِ رہبانی
عذارِ نرم و نازک پر شفق کی رنگ افشانی
قدم پر لوٹتی ہے عظمتِ تاجِ سلیمانی
ازل سے معتقد ہے محفلِ نورانیاں اُسکی

ادائیں لے کے آئی ہے وہ فطرت کے خزانوں سے
جگا سکتی ہے محفل کو نظر کے تازیانوں سے
وہ ملکہ ہے خراج اُس نے لئے ہیں بوستانوں سے
بس اک میں نے ہی اکثر کی ہیں نافرمانیاں اُس کی

وہ میری جرأتوں پر بے نیازی کی سزا دینا
ہوس کی ظلمتوں پر ناز کی بجلی گرا دینا
نگاہِ شوق کی بے باکیوں پر مُسکرا دینا
جنوں کو درسِ تمکیں دے گئیں نادانیاں اُس کی

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے!
مجھے چاہا ہے مجھ کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا ہے
مرا ہر شعر تنہائی میں اُس نے گنگنایا ہے
سُنی ہیں میں نے اکثر چھپ کے نغمہ خوانیاں اُسکی

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں
مرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہے گیت گائے ہیں
مری دُنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اُس کی

لبِ لعلین پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبینِ نور افشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اُس کا تبسم اُس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر دامانیاں اُس کی

کوئی میرے سوا اس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس بارگاہِ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اُس کی

ایک غمگین یاد!

مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فرازِ آسماں پر کہکشاں حسرت سے تکتی تھی
محبت جب چمک اُٹھتی تھی اُسکی چشمِ خنداں میں
نمستانِ فلک سے نُور کی صہبا چھلکتی تھی

مرے بازو پہ جب وہ زلفِ شبگوں کھول دیتی تھی
زمانہ نکہتِ خلدِ بریں میں ڈوب جاتا تھا

مرے شانے پہ جب سر رکھ کے ٹھنڈی سانس لیتی تھی
مری دُنیا میں سوز و ساز کا طوفان آتا تھا

وہ میرا شعر جب میری ہی لے میں گنگناتی تھی
مناظر جھُومتے تھے بام و در کو وجد آتا تھا
مری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر جب مُسکراتی تھی
مرے ظلمت کدے کا ذرّہ ذرّہ جگمگاتا تھا

اُمنڈ آتے تھے جب اشکِ محبت اُسکی پلکوں تک
ٹپکتی تھی در و دیوار سے شوخی تبسم کی
جب اُسکے ہونٹ آجاتے تھے از خود میرے ہونٹوں تک
جھپک جاتی تھیں آنکھیں آسماں پر ماہ و انجم کی

وہ جب ہنگامِ رخصت دیکھتی تھی مجھ کو مڑ مڑ کر
تو خود فطرت کے دل میں محشرِ جذبات ہوتا تھا
وہ محوِ خواب جب ہوتی تھی اپنے نرم بستر پر
تو اُس کے سر پہ مریم کا مقدس ہاتھ ہوتا تھا
خبر کیا تھی کہ وہ اک روز مجھ کو بھول جائے گی
اور اُس کی یاد مجھ کو خون کے آنسو رلائے گی

قطعہ

سحر سرِ شامی حسن جواں ہو جاتا ہے
گل فشانی تا بجبیں شعلہ فشاں ہو جاتا ہے
کہاں ہے کس کا اک نگاہ لطف کا سبب زیب
کوئی افسانہ بنا کر بدگماں ہو جاتا ہے

اُن کا جشنِ سالگرہ!

اِک مجمعِ رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی
بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

ہونٹوں پہ فدا رُوحِ بہارِ گل و نسریں
آنکھوں کی چمک رو کشِ بزمِ مہ و پرویں
پیراہنِ زرتار میں اک پیکرِ سیمیں

لہریں سی وہ لیتا ہوا اک پھول کا سہرا
سہرے میں جھمکتا ہوا اک چاند سا مکھڑا
اک رنگ سا رُخ پر کبھی ہلکا کبھی گہرا

ہر سانس میں احساس فراواں کی کہانی
خاموشیِ محجوب میں اک سیلِ معانی
جذبات کے طوفاں میں ہے دوشیزہ جوانی

فطرت نئے جذبات کے در کھول رہی ہے
میزانِ جوانی میں اُسے تول رہی ہے
لب ساکت و صامت ہیں نظر بول رہی ہے

سرشار نگاہوں میں حیا جھوم رہی ہے
ہیں رقص میں افلاک زمیں گھوم رہی ہے
شاعر کی وفا بڑھ کے قدم چوم رہی ہے

اے تو کہ ترے دم سے مری زمزمہ خوانی
ہو تجھ کو مبارک یہ تری نورِ جہانی
افکار سے محفوظ رہے تیری جوانی

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

قطعہ

مری غزلت مستی [illegible] مستی
عید نوروز [illegible] آں مستی
چارہ سازی انبساط [illegible] مستی
ساغر آرا [illegible] کی بان مستی

بربطِ شکستہ

اُس نے جب کہا مجھ سے گیت اک سُنا دو نا
سرد ہے فضا دل کی، آگ تم لگا دو نا

کیا حسین تیور تھے، کیا لطیف لہجہ تھا
آرزو بھی، حسرت تھی، حکم تھا، تقاضا تھا

گنگنا کے مستی میں ساز لے لیا میں نے
چھیڑ ہی دیا آخر نغمۂ وفا میں نے

یاس کا دھواں اُٹھا ہر نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی بربطِ شکستہ سے

حُسن و عشق

مجُھ سے مت پُوچھ "مرے حُسن میں کیا رکھا ہے"
آنکھ سے پردۂ ظلمات اُٹھا رکھا ہے
میری دُنیا کہ مرے غم سے جہنّم بردوش
تو نے دنیا کو بھی فردوس بنا رکھا ہے

مجھ سے مت پوچھ "ترے عشق میں کیا رکھا ہے"
سوز کو ساز کے پردے میں چھپا رکھا ہے
جگمگا اُٹھتی ہے دُنیائے تخیل جس سے
دل میں وہ شعلۂ جانسوز دبا رکھا ہے

نورا

نرس کی چارہ گری

وہ نوخیز نورا وہ اک بنتِ مریم — وہ مخمور آنکھیں وہ گیسوئے پُرخم
وہ ارضِ کلیسا کی ایک ماہ پارہ — وہ دیر و حرم کے لئے اک شرارہ
وہ فردوسِ مریم کا اک غنچۂ تر — وہ تثلیث کی دخترِ نیک اختر
وہ اک نرس تھی چارہ گر جسکو کہیے — مداوائے دردِ جگر جس کو کہیے
جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی — ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی
وہ پُر رعب تیور وہ شاداب چہرہ — متاعِ جوانی پہ فطرت کا پہرہ
مری حکمرانی ہے اہلِ زمیں پر — یہ تحریر تھا صاف اُس کی جبیں پر

سفید اور شفاف کپڑے پہن کر — مرے پاس آتی تھی اک حور بن کر
وہ اک آسمانی فرشتہ تھی گویا — کہ انداز تھا اس میں جبریل کا سا
وہ اک مرمریں حورِ خلدِ بریں کی — وہ تعبیر آذر کے خواب حسیں کی
وہ تسکینِ دل تھی سکونِ نظر تھی — نگارِ شفق تھی جمالِ سحر تھی
وہ شعلہ، وہ بجلی، وہ جلوہ، وہ پرتو — سلیماں کی وہ اک کنیزِ سبک رو
کبھی اسکی شوخی میں سنجیدگی تھی — کبھی اسکی سنجیدگی میں بھی شوخی
گھڑی چپ، گھڑی کرنے لگتی تھی باتیں — سرہانے مرے کاٹ دیتی تھی راتیں
عجب چیز تھی وہ عجب راز تھی وہ — کبھی سوز تھی وہ، کبھی ساز تھی وہ
نقاہت کے عالم میں جب آنکھ اٹھتی — نظر مجھ کو آتی محبت کی دیوی
وہ اس وقت اک پیکرِ نور ہوتی — تخیل کی پرواز سے دور ہوتی
وہ انجیل پڑھکر سناتی تھی مجھ کو — ہنساتی تھی مجھ کو رلاتی تھی مجھ کو
دوا اپنے ہاتھوں سے مجھ کو پلاتی — اب اچھے ہو ہر روز مژدہ سناتی

سرہانے مرے ایک دن سر جھکائے　　وہ بیٹھی تھی تکیے پہ کہنی ٹکائے

خیالات پیہم میں کھوئی ہوئی سی　　نہ جاگی ہوئی سی نہ سوئی ہوئی سی

جھپکتی ہوئی بار بار اُسکی پلکیں　　جبیں پُر شکن بیقرار اُسکی پلکیں

وہ آنکھوں کے ساغر چھلکتے ہوئے سے　　وہ عارض کے شعلے بھڑکتے ہوئے سے

لبوں میں تھا لعل و گہر کا خزانہ　　نظر عارفانہ، ادا راہبانہ

مہک گیسوؤں سے چلی آ رہی تھی　　مرے ہر نفس میں بسی جا رہی تھی

مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سوجھی　　جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی

ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکالی　　لبِ لعل افشاں سے اک شے چُرالی

وہ شے جسکو اب کیا کہوں کیا سمجھئے　　بہشتِ جوانی کا تحفہ سمجھئے

شرابِ محبت کا اک جامِ رنگیں　　سُبو زارِ فطرت کا اک جامِ رنگیں

میں سمجھا تھا شاید بگڑ جائیگی وہ　　ہواؤں سے لڑتی ہے لڑ جائیگی وہ

میں دیکھوں گا اُسکے بپھرنے کا عالم　　جوانی کا غصہ بکھرنے کا عالم

اِدھر دل میں اک شورِ محشر بپا تھا — مگر اُس طرف رنگ ہی دوسرا تھا
ہنسی وہ ہنسی اس طرح کھلکھلا کر — کہ شمعِ حیا رہ گئی جھلملا کر
نہیں جانتی ہے مرا نام تک وہ — مگر بھیج دیتی ہے پیغام تک وہ
یہ پیغام آتے ہی رہتے ہیں اکثر
کہ کس روز آؤ گے بیمار ہو کر

قطعہ

زندگی سے اجتناب زور پہ ہے
بیکسی کا ہر وقت اب زور پہ ہے
سکہ نہ بیٹھا مجاز اب یہاں بھی
ابھی میرا شباب زور پہ ہے

ننھی پجارن

اک ننھی منی سی پجارن — پتلی باہیں، پتلی گردن
بھور بھئے مندر آئی ہے — آئی نہیں ہے ماں لائی ہے
وقت سے پہلے جاگ اٹھی ہے — نیند ابھی آنکھوں میں بھری ہے
ٹھوڑی تک لٹ آئی ہوئی ہے — یونہی سی لہرائی ہوئی ہے
آنکھوں میں تاروں کی چمک ہے — مکھڑے پہ چاندی کی جھلک ہے
کیسی سندر ہے کیا کہیے — ننھی سی اک سیتا کہیے
دھوپ چڑھے تارا چمکا ہے — پتھر پر اک پھول کھلا ہے
چاند کا ٹکڑا پھول کی ڈالی — کمسن سیدھی بھولی بھالی
ہاتھ میں پیتل کی تھالی ہے — کان میں چاندی کی بالی ہے

دل میں لیکن دھیان نہیں ہے
پُوجا کا کچھ گیان نہیں ہے
کیسی بھولی اور سیدھی ہے
مندر کی چھت دیکھ رہی ہے
ماں بڑھ کر چٹکی لیتی ہے
چپکے چپکے ہنس دیتی ہے
ہنسنا رونا اس کا مذہب
اُس کو پُوجا سے کیا مطلب

خود تو آئی ہے مندر میں
من اُس کا ہے گڑیا گھر میں

آج کی رات!

دیکھنا جذبِ محبت کا اثر آج کی رات
میرے شانے پہ ہے اُس شوخ کا سر آج کی رات

اور کیا چاہیئے اب اے دلِ مجروح تجھے!
اُس نے دیکھا تو بہ اندازِ دگر آج کی رات

پھول کیا خار بھی ہیں آج گلستاں بکنار
سنگریزے ہیں نگاہوں میں گہر آج کی رات

محوِ گلگشت ہے یہ کون مرے دوش بدوش
کہکشاں بن گئی ہر راہ گزر آج کی رات

پھوٹ نکلا در و دیوار سے سیلابِ نشاط
اللہ اللہ مرا کیفِ نظر آج کی رات

شبستانِ تجلّی کا فسوں کیا کہئے!
چاند نے پھینک دیا رختِ سفر آج کی رات

نور ہی نور ہے کس سمت اُٹھاؤں آنکھیں
حسن ہی حسن ہے "تا حدِ نظر" آج کی رات

قصرِ گیتی میں اُمنڈ آیا ہے طوفانِ حیات
موت لرزاں ہے پسِ پردۂ در آج کی رات

اللہ اللہ وہ پیشانیِ سیمیں کا جمال!
رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات

عارضِ گرم پہ وہ رنگِ شفق کی لہریں
وہ مری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات

نرگسِ ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار!
وہ مرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات

نغمہ وہ مے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہئے!
گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات

میری ہر سانس پہ وہ اُن کی توجہ کیا خوب!
میری ہر بات پہ وہ جنبشِ سر آج کی رات

وہ تبسم ہی تبسم کا جمالِ پیہم!
وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات

اُف وہ وارفتگیِ شوق میں اک وہمِ لطیف
کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پہ نظر آج کی رات

مذہبِ عشق میں جائز ہے یقیناً جائز
چُوم لوں میں لبِ لعلیں بھی اگر آج کی رات

اپنی رفعت پہ جو نازاں ہیں تو نازاں ہی رہیں
کہدو انجم سے کہ دیکھیں نہ اِدھر آج کی رات

اُن کے الطاف کا اتنا ہی فسوں کافی ہے
کم ہے پہلے سے بہت دردِ جگر آج کی رات

قطعہ

دل کو مجبورِ غمِ دلدار کیے بیٹھے ہیں
زندہ بیٹھے ہیں یہ الزام سر اپنے لیے بیٹھے ہیں
چاہتے ہیں کہ ہر اک ذرہ چمن بن جائے
اور خود دل ہی میں اک خار لیے بیٹھے ہیں

بتانِ حرم

کیا کہوں میں رات کس محفل میں تھا گرمِ نوا
نغمہ و نکہت کا وہ طوفان وہ ٹھنڈی ہوا
دیدنی تھا نازنینانِ تمدن کا ہجوم
بے حقیقت تھے نگاہوں میں مہ و مہر و نجوم
ناز پروردہ حسیں، افکارِ غم سے بے نیاز
مہ جبینانِ حرم قیدِ حرم سے بے نیاز
جن کی اک جنبش سے بنیادِ حرم میں ارتعاش
جن کی اک ٹھوکر سے زنجیرِ قدامت پاش پاش

بن گیا تھا یک بیک فردوسِ کیف و انبساط
اک دیرینہ کرم فرما کا ایوانِ نشاط
نرم صوفے گود میں فردوسِ رعنائی لئے
زُلف کے خم، مرمریں شانوں کی برنائی لئے
وہ حسیں پیشانیاں آئینۂ تمکینِ ناز
وہ رسیلی مدھ بھری آنکھیں وہ مژگانِ دراز
وہ سبک چاندی سے پیکر وہ جوانی کا نکھار
آذرِ فطرت کی صناعی کے زندہ شاہکار
رُخ پہ شادابی، لبوں میں رس، تبسم برق پاش
چست پیراہن، نمایاں جسمِ سیمیں کی تراش
شوخ آنکھیں بادۂ گلگوں کے پیمانے لئے
گیسوئے شبرنگ پیچ و خم میں افسانے لئے

آہ وہ حُسنِ مقابل وہ جمالِ ہم نشیں
دامنِ موجِ ہوا میں اک بہشتِ عنبریں
شوخیاں اُنکی حیا کے رنگ میں ڈوبی ہوئی
سادگی اُس کی ادا کے رنگ میں ڈوبی ہوئی

اک طرف سحرِ ملاحت، اک طرف افسونِ ناز
اک طرف زُلفِ بریدہ، اک طرف زلفِ دراز
آنچلوں کی سرسراہٹ، زمزمے گاتی ہوئی
پیرہن سے نکہتِ خلدِ بریں آتی ہوئی

آہ وہ دوشیزہ لب، گلریز لب، گلنار لب
آہ وہ لب آشنا لب، شوخ لب، خونبار لب
وہ حجاب آگیں تکلم، وہ رسیلے قہقہے
وہ نشاط آگیں تبسم، وہ سُریلے قہقہے

تھے جن میں صبا کا راگ سیاروں کے گیت
نقرئی نے کی صدا جنت کے مہ پاروں کے گیت
جامِ زرّیں کی کھنک سی قلقلِ مینا کے ساتھ
قدسیوں کی لے سرودِ بربطِ زہرا کے ساتھ
شوخیِ لب ناز فرما خندۂ بے باک پر
نور و موسیقی کی اک بارش سی فرشِ خاک پر
گفتگو کچھ اس سلیقے سے کچھ اس انداز سے
دل بچانا سخت مشکل تھا کمندِ ناز سے
وہ لچک سی جسمِ نازک میں خود اپنے بار سے
پھوٹ نکلیں تھیں شعاعیں عارض و رخسار سے
وہ سمٹنے کی ادا طوفانِ رعنائی کے ساتھ
ذوقِ خود بینی مذاقِ بزم آرائی کے ساتھ

عارضوں پر اک گلابی پن سا ماتھوں پر دمک
انکھڑیوں میں اک سرورِ فتح مندی کی جھلک
بام و در پر اک تبسم سا، فضا گلرنگ تھی
جنبشِ مژگاں دھڑکتے دل سے ہم آہنگ تھی
میرا نغمہ باعثِ دلداریٔ خوباں تو ہے
میرا نالہ خیر سے وجہِ نشاطِ جاں تو ہے

اصنامِ عشق

وہ کچھ دوشیزگانِ ناز پرور — کھڑی ہیں اک بساطی کی دکاں پر
نظر کے سامنے ہے ایک محشر — اور اک محشر ہے میرے دل کے اندر
سنہرا کام رنگیں ساریوں پر — بساطِ آسماں پر ماہ و اختر
جمال و حُسن کے پُر رعب تیور — نمایاں چاندسی پیشانیوں پر
وہ رُخساروں پہ ہلکی ہلکی سُرخی — لبوں میں پرفشاں روحِ گلِ تر
سیہ زلفوں میں رُوحِ سنبلستاں — نظر سرچشمۂ تسنیم و کوثر
ادائے ناز غرقِ کیفِ صہبا — سیہ مژگاں شراب آلودہ نشتر
چمک تاروں کی چشمِ سرمگیں میں — جھلک چاندی کی جسمِ مرمریں پر
وہ خوشبو آرہی ہے پیرہن سے — فضا ہے دُور تک جس سے معطّر

تبسم اور ہنسی کے نرم طوفاں — فضاؤں میں مسلسل بارشِ زر
نشاطِ رنگ و بو سے چور آنکھیں — شرابِ ناب سے لبریز ساغر
وہ محرابیں سی سینوں پر نمایاں — فضائے نور میں کیوپڈ کے شہپر
نفس کی آمد و شد سے تلاطم — شبِ مہتاب میں جیسے سمندر
ستاروں کی نگاہیں جھک گئی ہیں — زمیں پھر خندہ زن ہے آسماں پر
کوئی آئینہ دارِ حسنِ نارس — کسی میں حسنِ یونانی کے جوہر
کسی میں عکسِ "معصومِ کلیسا" — کسی میں پرتوِ اصنامِ آذر
یہ شیریں ہے وہ نوشابہ ہے شاید — نہیں یاں فرق فرہاد و سکندر
یہ تابانی میں خورشیدِ درخشاں — وہ رعنائی میں اس سے بھی فزوں تر
ہنسی اس کی طلوعِ صبحِ خنداں — نوا اس کی سرودِ کیف آور
یہ شعلہ آفریں وہ برق افگن — یہ آئینہ جبیں وہ ماہ پیکر

وہ جنبش سی ہوئی کچھ آنچلوں کو — وہ لہریں سی اٹھیں کچھ ساریوں پر

خرامِ ناز سے نغمے جگاتی!   وہ چل دیں ایک جانب مسکرا کر
کسی کی حسرتیں پامال کرتی   کسی کی حسرتیں ہمراہ لے کر
کبھی آنکھیں دکانوں پر جمی ہیں   کبھی خود اپنی ہی برنائیوں پر

اِدھر ہم نے اِک آہ سرد کھینچی
ہنسی پھر آ گئی اپنے کئے پر

قطعہ

اپنا غم اوروں کو دے، اوروں کا غم اپنے سے کیا
پی سکتی یار اک بار آ گئی اس کھینچے سے کیا
بات تو جب ہے کہ مر جا عرصہ گاہ دہر میں
اس پہ مر جانے سے کیا اور اس پہ مرنے سے کیا

نذرِ خالدہ

(مسلم یونیورسٹی یونین ہال میں خالدہ ادیب خانم کا خیر مقدم)

دل مسرت کی فراوانی سے دیوانہ ہے آج
دیکھنا یہ کون آخر زیبِ کاشانہ ہے آج
کیفِ صہبائے طرب میں غرق میخانہ ہے آج
ہر شجر ساقیِ مے ہر پھول پیمانہ ہے آج
غنچہ و گل تھے یہی لیکن یہ رعنائی نہ تھی
اس گلستاں میں بہار اس دھوم سے آئی نہ تھی

نرگسِ مخمور ہے لذت کشِ خوابِ نشاط
پھوٹ نکلا ہے گل و نسریں سے سیلابِ نشاط
اہلِ محفل کے لئے مشکل ہے اب تابِ نشاط
آج پیمانوں سے چھلکے گی مے نابِ نشاط

پرفشاں ہے جذبۂ پنہاں اُبھرنے کیلئے
مضطرب ہے ذرہ ذرہ رقص کرنے کیلئے

پھر اِدھر آئے نہ آئے یہ شمیمِ جاں فزا
پھر میسر ہو نہ ہو ایسا سماں ایسی ہوا
چھیڑ اِس انداز سے اے مطربِ رنگیں نوا
ٹوٹ جائے آج اک اک تار تیرے ساز کا

ذکر جس کا زہرہ و پرویں کے کاشانے میں ہے
وہ صنم بھی آج اپنے ہی صنم خانے میں ہے

خالدہ تو ہے بہشتِ ترکمانی کی بہار
تیری پیشانی پہ نورِ حریت آئینہ کار
تیرے رُخ سے پرتوِ معصومِ مریم آشکارا
تیرے جلووں کی صباحت سے فرشتے شرمسار
گل پشیماں قلبِ بلبل رشک سے دو نیم ہے
تیری باتوں میں خمارِ کوثر و تسنیم ہے

یوں تو ہم ہر شمعِ علم و فن کے پروانے رہے
یہ حقیقت ہے کہ ہم تیرے بھی دیوانے رہے
مدتوں اپنی زباں پر تیرے افسانے رہے
تو رہی بیگانہ لیکن ہم نہ بیگانے رہے

یاد تیری اک زمانے سے ہمارے دل میں تھی
تو یہاں آنے سے پہلے بھی اسی محفل میں تھی

شوق کی شورش جمال و نور کا سیلاب ہے
ہر کلی سازِ طرب ہے ہر نظر مضراب ہے
آنکھ حیراں روحِ اربابِ وفا بیتاب ہے
یہ ہمارے خواب کی تعبیر ہے یا خواب ہے
لالہ و گُل کیا چمن بھی تیرے قدموں پر نثار
یہ گہر ہائے سخن بھی تیرے قدموں پر نثار

اے مقدّس حور اے پروردۂ موجِ نسیم
رُوحِ عشرت گاہِ ساحل جانِ طوفانِ عظیم
تُو نے ترکوں کو دکھائی ہے صراطِ مستقیم
پھونک ڈالے ہیں تعصب کے حجاباتِ قدیم
ضعف دکھلایا ہے جب بھی فطرتِ احرار نے
آگ برسادی ہے تیرے نطقِ گوہر بار نے

رہ چکی ہے ہاتھ میں تیرے وہ تیغِ بے نیام
جس کی جنبش نے بدل ڈالا حکومت کا نظام
تُرکِ افتادہ کو تو نے ہی دیا اذنِ خرام
تیرے ہی ہاتھوں نے چھلکائے ہیں آزادی کے جام

تو نے جو احساں کئے ہیں ملتِ احرار پر
نقش ہیں اب تک سمرنا کے در و دیوار پر

ہاں بتائے ہم کو بھی اے رُوحِ اربابِ نیاز
کس طرح مٹتا ہے آخر رنگ و خوں کا امتیاز
دل پہ کیوں کر فاش ہو جاتے ہیں آزادی کے راز
چھیڑتے ہیں کسطرح محفل میں بیداری کا ساز

تیری آنکھوں میں سرورِ عشرتِ جمہور ہے
آہ یہ جوہر ہماری دسترس سے دُور ہے

محرمِ دردو مسرت رازدارِ صبح و شام
محفلِ فطرت کی خاموشی ہے تجھ سے ہم کلام
تیری ہستی آسمانِ ترک کا ماہِ تمام
تو محبت، ہر نفس تیرا محبت کا پیام

گلشنِ مشرق میں مانندِ صبا آئی ہے تو!
صبحِ روشن کا پیامِ جانفزا لائی ہے تو

قربتِ گُل کس قدر جاں بخش ہے خاروں سے پوچھ
چاند کی تنویر میں کیا لطف ہے تاروں سے پوچھ
نشۂ صہبا میں کیا لذت ہے میخواروں سے پوچھ
چارہ سازی میں مزا کیا ہے یہ بیماروں سے پوچھ

رُوح و دل کو جگمگا دے جلوہ آرائی تری
کم سے کم اتنا تو کر جائے مسیحائی تری

کوئی دم میں اس گلستاں سے نکلنا ہے ہمیں
فرشِ گُل سے دُور انگاروں پہ چلنا ہے ہمیں
خارزارِ غم کو پیروں سے کچلنا ہے ہمیں
جادۂ منزل میں گرنا ہے سنبھلنا ہے ہمیں

درس ایسا دے کہ دل آزردۂ منزل نہ ہو
فکرِ لاحاصل نہ ہو، اندیشۂ باطل نہ ہو

رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دلنشیں
آندھیوں میں مینھ برسنے کی صدا آتی ہوئی
جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کے گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی

نونہالوں کو سُناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی
ٹھوکریں کھا کر، لچکتی، گنگناتی جھومتی
سرخوشی میں گھنگرؤں کی تال پر گاتی ہوئی
ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی
رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی، کانپتی
پٹڑیوں پر دُور تک سیماب جھلکاتی ہوئی
جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی
منتشر کر کے فضا میں جابجا چنگاریاں
دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی

تیز تر ہوتی ہوئی منزل بمنزل دم بدم
رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی
سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی
اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے
رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی
ایک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی
رعشہ بر اندام کرتی انجمِ شب تاب کو
آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی!
یاد آ جائے پُرانے دیوتاؤں کا جلال
اِن قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی

ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کیساتھ
خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی
مرغزاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام
وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی
اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغِ طور دکھلاتی ہوئی
جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی
چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی
غیظ کے عالم میں منھ سے آگ برساتی ہوئی
رینگتی، مڑتی، مچلتی۔ تلملاتی، ہانپتی
اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی

خود بخود روٹھی ہوئی، بپھری ہوئی، بکھری ہوئی
شورِ پیہم سے دلِ گیتی کو دھڑکاتی ہوئی
پُل پہ دریا کے دمادم کوندتی للکارتی
اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی
پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پر ریت کے ذروں کو چمکاتی ہوئی
منہ میں گھستی ہے سرنگوں کے یکایک دوڑ کر
دندناتی، چیختی، چنگھاڑتی، گاتی ہوئی
آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی، سمٹی ہوئی
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی

تیزیٔ رفتار کے سکّے جماتی جا بجا!
دشت و در میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی

ڈال کر گزرے مناظر پر اندھیرے کا نقاب
اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی

صفحۂ دل سے مٹاتی عہدِ ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دلکش خواب دکھلاتی ہوئی

ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی

دامنِ تاریکیٔ شب کی اڑاتی دھجیاں
قصرِ ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی

زد میں کوئی چیز آ جائے تو اُس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی

زعم میں پیشانیٔ صحرا پہ ٹھوکر مارتی!
پھر سبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی
ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ دَرّاتی ہوئی
ایک اک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار
عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ ہوا میں سینکڑوں جنگی دہل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جانفزا آواز لہراتی ہوئی
الغرض اُڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

میرا چمن

(نذرِ علیگڈھ)

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن ہیں اپنے چمن کا بلبل ہوں

ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغرِ نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حُسن ٹپکتا ہے پھُولوں سے جوانی اُبلتی ہے

جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اِس دشت کے گوشے گوشے سے ایک جوئے حیات اُبلتی ہے

اسلام کے اس بُت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس میخانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی

یاں حُسن کی برق چمکتی ہے، یاں نُور کی بارش ہوتی ہے
ہر آہ یہاں اک نغمہ ہے ہر اشک یہاں اک موتی ہے

ہر شام ہے شامِ مصر یہاں، ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں

یہ دشتِ جنوں دیوانوں کا، یہ بزمِ وفا پروانوں کی
یہ شہرِ طرب رومانوں کا یہ خلد بریں ارمانوں کی

فطرت نے سکھائی ہے ہم کو افتاد یہاں پرواز یہاں
گائے ہیں وفا کے گیت یہاں، چھیڑا ہے جنوں کا ساز یہاں

اس فرش سے ہم نے اُڑ اُڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی، پروین سے رشتے جوڑے ہیں

اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں اِس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں

اس بزم میں نیزے پھینکے ہیں اس بزم میں خنجر چومے ہیں
اس بزم میں گِر گِر تڑپے ہیں اس بزم میں پی کر جھومے ہیں
آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے
یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں یاں ہم نے شبخوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اُتارے ہیں
ہر آہ ہے خود تاثیر یہاں ہر خواب ہے خود تعبیر یہاں
تدبیر کے پائے سنگیں پر جُھک جاتی ہے تقدیر یہاں
ذرات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں
خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے باطل کی شکستِ فاش یہاں
اس گلکدہ پارینہ میں پھر آگ بھڑکنے والی ہے
پھر ابر گرجنے والے ہیں، پھر برق کڑکنے والی ہے

جو ابر یہاں سے اُٹھے گا، وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہِ گراں پر برسے گا
ہر سرو و سمن پر برسے گا، ہر دشت و دمن پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا، غیروں کے چمن پر برسے گا
ہر شہرِ طرب پر گرجے گا، ہر قصرِ طرب پر کڑکے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا

قطعہ

خرمنِ دل جلا رہا ہوں میں
نقشِ ہستی مٹا رہا ہوں میں
مژدہ نغمہ سر ہے اے دوست
تیری ہی سمت آ رہا ہوں میں

شوقِ گریزاں

دیر و کعبہ کا میں نہیں قائل
دیر و کعبہ کو آستاں نہ بنا

مجھ میں تو روحِ سرمدی مت پھونک
رونقِ بزمِ عارفاں نہ بنا

دشتِ ظلمات میں بھٹکنے دے
میری راہوں کو کہکشاں نہ بنا

عشرتِ جہل و تیرگی مت چھین
محرمِ رازِ دو جہاں نہ بنا

بجلیوں سے جہاں نہ ہو چشمک
اُس گلستاں میں آشیاں نہ بنا

خارِ چشمِ حریف رہنے دے
حرزِ بازوئے دوستاں نہ بنا

میری خود بینیاں نہ لے مجھ سے
جلوہ افروزِ مہوشاں نہ بنا

دِلِ صد پارۂ حوادث کو
تختۂ مشقِ گلرخاں نہ بنا

میری خود داریوں کا خون نہ کر
مطربِ بزمِ دلبراں نہ بنا

ماہ و انجم سے مجھ کو کیا نسبت　　مجھ کو ان کا مزاجداں نہ بنا
جس کو اپنی خبر نہیں رہتی　　اُس کو سالارِ کارواں نہ بنا
میری جانب نگاہِ لطف نہ کر　　غم کو اس درجہ کامراں نہ بنا
اس زمیں کو زمیں ہی رہنے دے　　اِس زمیں کو تو آسماں نہ بنا
میری ہستی نیازِ شوق سہی　　اِس کو عنوانِ داستاں نہ بنا
راز تیرا چھپا نہیں سکتا!
تُو مجھے اپنا رازداں نہ بنا

دِلّی سے واپسی!

رخصت اے دلّی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں، نالہ بہ لب جاتا ہوں میں
یاد آئیں گے مجھے تیرے زمین و آسماں
رہ چکے ہیں میری جولانگاہ تیرے بوستاں
تیرا دل دھڑکا چکے ہیں میرے احساسات بھی
تیرے ایوانوں میں گونجے ہیں میرے نغمات بھی
رشکِ شیرازِ کہن، ہندوستاں کی آبرو!
سرزمینِ حسن و موسیقی، بہشتِ رنگ و بو

معبدِ حسن و محبت ، بارگاہِ سوز و ساز
تیرے تبخانے حسیں ، تیرے کلیسا دلنواز
ذکرِ یوسف کا تو کیا کیجیے تری سرکار میں
خود زلیخا آ کے بکتی ہے ترے بازار میں
جنّتیں آباد ہیں تیرے در و دیوار میں
اور تُو آباد خود شاعر کے قلبِ زار میں
محفلِ ساقی سلامت ! بزمِ انجم برقرار
نازنینانِ حرم پر رحمتِ پروردگار
یاد آئے گی مجھے بے طرح یاد آئے گی تُو !
عین وقتِ مے کشی آنکھوں میں پھر جائے گی تُو !
کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
چھوڑ کر خلدِ علیگڈھ کی ہزاروں محفلیں

کتنے رنگیں عہد و پیماں توڑ کر آیا تھا میں
دل نوازانِ چمن کو چھوڑ کر آیا تھا میں
اک نشیمن میں نے چھوڑا ، اک نشیمن چھٹ گیا!
ساز بس چھیڑا ہی تھا میں نے کہ گلشن چھٹ گیا
دل میں سوزِ غم کی اک دُنیا لئے جاتا ہوں میں
آہ تیرے میکدے سے بے پئے جاتا ہوں میں
جاتے جاتے لیکن اک پیماں کئے جاتا ہوں میں
اپنے عزمِ سرفروشی کی قسم کھاتا ہوں میں
پھر تری بزمِ حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤں گا میں اور باندازِ دگر آؤں گا میں
آہ وہ چکر دیئے ہیں گردشِ ایّام نے
کھول کر رکھدی ہیں آنکھیں تلخیِ آلام نے

فطرتِ دل دشمنِ نغمہ ہوئی جاتی ہے اب
زندگی اک برق، اک شعلہ ہوئی جاتی ہے اب
سر سے پا تک ایک خونیں راگ بن کر آؤں گا
لالہ زارِ رنگ و بُو میں آگ بن کر آؤں گا

قطعہ

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

گریز

یہ جا کر کوئی بزمِ خوباں میں کہہ دو
کہ اب درخورِ بزمِ خوباں نہیں میں
مبارک تمھیں قصر و ایواں تمھارے
وہ دلدادۂ قصر و ایواں نہیں میں
جوانی بھی سرکش، محبّت بھی سرکش
وہ زندانیٔ زلفِ پیچاں نہیں میں
تڑپ میری فطرت، تڑپتا ہوں لیکن
وہ زخمیِ سوفارِ مژگاں نہیں میں

دھڑکتا ہے دل اب بھی راتوں کو لیکن
وہ نوحہ گرِ دردِ ہجراں نہیں میں
بایں تشنہ کامی ، بہ ایں تلخ کامی
رہینِ لبِ شکّر افشاں نہیں میں
شراب و شبستاں کا مارا ہوں لیکن
وہ غرقِ شراب و شبستاں نہیں میں
قسم نطق کی شعلہ افشانیوں کی
کہ شاعر تو ہوں، اب غزلخواں نہیں میں

مہمان

آج کی رات اور باقی ہے
کل تو جانا ہی ہے سفر پہ مجھے
زندگی منتظر ہے منہ پھاڑے
زندگی، خاک و خون میں لتھڑی
آنکھ میں شعلہ ہائے تند لئے
دو گھڑی خود کو شادماں کرلیں
آج کی رات اور باقی ہے

چلنے ہی کو ہے اک سموم ابھی
رقص فرما ہے روحِ بربادی
بربریت کے کارروانوں سے
زلزلے میں ہے سینۂ گیتی

ذوقِ پنہاں کو کامراں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے!

ایک پیمانۂ مئے سرجوش
لطفِ گفتار گرمئ آغوش
بوسے — اس درجہ آتشیں بوسے
پھونک ڈالیں جو میری کشتِ ہوش

روح یخ بستہ ہے تپاں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

ایک دو اور ساغرِ سرشار
پھر تو ہونا ہی ہے مجھے ہشیار
چھیڑنا ہی ہے سازِ زیست مجھے
آگ برسائیں گے لبِ گفتار

کچھ طبیعت تو ہم رواں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

پھر کہاں یہ حسیں سہانی رات
یہ فراغت، یہ کیف کے لمحات
کچھ تو آسودگیٔ ذوقِ نہاں
کچھ تو تسکینِ شورشِ جذبات

آج کی رات جاوداں کر لیں
آج کی رات، اور آج کی رات

شکوۂ مختصر!

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی اُن زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوقِ رسوا کی پذیرائی
مجھے شکوہ نہیں اُن پاک باطن نکتہ چینوں سے
لبِ معجز نما نے، جن کے مجھ پر آگ برسائی
مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے اُن پاسبانوں سے
نہ لینے دی جنھوں نے فطرتِ شاعر کو انگڑائی
مجھے شکوہ نہیں دیر و حرم کے آستانوں سے
وہ جن کے در پہ کی ہے مدتوں میں نے جبیں سائی!

مجھے شکوہ نہیں افتادگانِ عیش و عشرت سے
وہ جن کو میرے حالِ زار پر اکثر ہنسی آئی
مجھے شکوہ نہیں اُن صاحبانِ جاہ و ثروت سے
نہیں آئی میرے حصّہ میں جن کی ایک بھی پائی
زمانہ کے نظام رنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانینِ کہن، آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے

طفلی کے خواب

طفلی میں آرزو تھی کسی دل میں، ہم بھی ہوں
اک روز سوز و ساز کی محفل میں ہم بھی ہوں

دل ہو اسیر گیسوئے عنبر سرشت میں
الجھے انھیں حسین سلاسل میں ہم بھی ہوں

چھیڑا ہے ساز حضرت سعدی نے جس جگہ
اس بوستاں کے شوخ عنادل میں ہم بھی ہوں

گائیں ترانے دوش ثریّا پہ رکھ کے سر
تاروں سے چھیڑ ہو مہ کامل میں ہم بھی ہوں

آزاد ہو کے کشمکشِ علم سے کبھی
آشفتگانِ عشق کی منزل میں ہم بھی ہوں

دیوانہ وار ہم بھی پھریں کوہ و دشت میں
دلدادگانِ شعلۂ محفل میں ہم بھی ہوں

دل کو ہو شاہزادیٔ مقصد کی دُھن لگی
حیراں سراغِ جادۂ منزل میں ہم بھی ہوں

صحرا ہو، خار زار ہو، وادی ہو، آگ ہو،
اک دن انھیں مہیب منازل میں ہم بھی ہوں

دریائے حشر خیز کی موجوں کو چیر کر
کشتی سمیت دامنِ ساحل میں ہم بھی ہوں

اک لشکرِ عظیم ہو مصروفِ کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں

چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغِ آب دار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں
قدموں پہ جن کے تاج ہیں اقلیمِ دہر کے
اُن چند کشتگانِ غمِ دل میں ہم بھی ہوں

قطعہ

اک سبک اور حسیں کار ابھی گزری ہے
گنگناتی ہوئی سرشار ابھی گزری ہے
سن رہا ہوں دلِ گیتی سے دھڑکنے کی صدا
خالقِ حسن کی شہکار ابھی گزری ہے

الٰہ آباد سے

الٰہ آباد میں ہر سو ہیں چرچے
کہ دلی کا شرابی آگیا ہے

بہ صد آوارگی، با صد تباہی
بہ صد خانہ خرابی آگیا ہے

گلابی لاؤ، چھلکاؤ، لنڈھاؤ
کہ شیدائے گلابی آگیا ہے

نگاہوں میں خمارِ بادہ لے کر
نگاہوں کا شرابی آگیا ہے

وہ سرکش، رہزنِ ایوانِ خوباں
بہ عزمِ باریابی آگیا ہے

وہ رسوائے جہاں، ناکام دوراں
بہ زعمِ کامیابی آگیا ہے

بتانِ ناز فرما سے یہ کہدو
کہ اک ترکِ شہابی آگیا ہے

نواسنجانِ سنگم کو بتادو
حریفِ فاریابی آگیا ہے

یہاں کے شہریاروں کو خبر دو
کہ مردِ انقلابی آگیا ہے

مادام

زلف کی چھاؤں میں عارض کی تب و تاب لیے
لب پہ افسوں لیے آنکھوں میں مئے ناب لیے
ہر نفس رو میں لیے شورشِ طغیان نہاں
ہر نظر شوق کا افسانۂ بے تاب لیے
سحر و اعجاز لیے جنبشِ مژگانِ دراز
خندۂ شوخ جمالِ دُرِ خوش آب لیے
ضو فگن رُوئے حسیں پر شبِ مہتابِ شباب
چشمِ مخمور نشاطِ شبِ مہتاب لیے

نشۂ نازِ جوانی میں شرابور ادا
جسم ذوقِ گہر اطلس و کمخواب لئے
زُلفِ شبرنگ لئے صندل و عود و عنبر
خمِ ابروئے حسیں دیر کی محراب لئے
لبِ گلرنگ حسیں، جسم گداز و سیمیں
شوخیِ برق لئے لرزشِ سیماب لئے
ایک صیّادِ خوش اندام سوادِ مشرق
زُلفِ بنگال لئے طلعتِ پنجاب لئے
نزہت و ناز کا اک پیکرِ شاداب حسیں
نکہت و نُور کا اُمڈا ہوا سیلاب لئے
میری وارفتگیٔ شوق مسلّم، لیکن
کس کی آنکھیں ہیں زلیخا کا حسیں خواب لئے

غزل

یہ میری دنیا یہ میری ہستی | نغمہ طرازی صہبا پرستی
سب سے گریزاں سب پر برستی | آنکھوں کی مستی مہنگی نہ سستی
شاعر کی دنیا، شاعر کی ہستی | یا نالۂ غم یا شورِ مستی
ان انکھڑیوں کا عالم نہ پوچھو | صہبا ہی صہبا، مستی ہی مستی
محوِ سفر ہوں، گرمِ سفر ہوں | میری نظر میں رفعت نہ پستی

وہ آ بھی جاتے وہ ہو بھی جاتے
چشمِ تمنا پھر بھی ترستی

غزل

برباد تمنا پہ عتاب اور زیادہ
ہاں میری محبت کا جواب اور زیادہ

روئیں نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے
ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

آوارہ و مجنوں ہی پہ موقوف نہیں کچھ
ملنے ہیں ابھی مجھ کو خطاب اور زیادہ

اٹھیں گے ابھی اور بھی طوفاں مرے دل سے
دیکھوں گا ابھی عشق کے خواب اور زیادہ

ٹپکے گا لہو اور مرے دیدۂ تر سے
دھڑکے گا دلِ خانہ خراب اور زیادہ
ہو گی مری باتوں سے انھیں اور بھی حیرت
آئے گا انھیں مجھ سے حجاب اور زیادہ
اے مطربِ بیباک کوئی اور بھی نغمہ
اے ساقیٔ فیاض شراب اور زیادہ

غزل

کمال عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں
یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں

تمھیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا
بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں

یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذ اللہ
تمھارا راز تمھیں سے چھپا رہا ہوں میں

اس اک حجاب پہ سو بے حجابیاں صدقے
جہاں سے چاہتا ہوں تم کو دیکھتا ہوں میں

بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل
ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں
مجھے سنے نہ کوئی مستِ بادۂ عشرت
مجازؔ ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

قطعہ

اے شاعرِ آشفتہ و سستِ مئے سرجوش
کیا کہیے کہ کیا شعروں میں تجھے یہ بھی نہیں ہوش
اک پیکرِ الطاف و عنایت پہ یہ طعنے
احسان فراموش، ارے احسان فراموش

غزل

سارا عالم گوش بر آواز ہے　　آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے
ہاں ذرا جرأت دکھالے جذب دل　　حسن کو پردے پہ اپنے ناز ہے
ہمنشیں دل کی حقیقت کیا کہوں　　سوز میں ڈوبا ہوا اک ساز ہے
آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم　　میری میخواری ابھی تک راز ہے
ہنس دیئے وہ میرے رونے پر مگر　　انکے ہنس دینے میں بھی اک راز ہے
چھپ گئے وہ ساز ہستی چھیڑ کر　　اب تو بس آواز ہی آواز ہے

ساری محفل جس پہ جھوم اٹھی مجاز
وہ تو آواز شکست ساز ہے

غزل

محبت کے سو رنگ سو سو اثر
کوئی نغمہ پیرا کوئی نوحہ گر

جہاں ٹھوکریں ہوں ہر اک گام پر
وہاں لغزشِ پا بنے راہبر

یہ سب ہاتھ ہیں خون سے جنکے تر
یہی تھے مسیحا یہی چارہ گر

جگر کی خبر ہے نہ دل کی خبر
مگر لڑ رہی ہے نظر سے نظر

غزل

عیش سے بے نیاز ہیں ہم لوگ
بے خودِ سوز و ساز ہیں ہم لوگ

جس طرح چاہے چھیڑ دے ہم کو
تیرے ہاتھوں میں ساز ہیں ہم لوگ

بے سبب التفات کیا معنی
کچھ تو اے چشم ناز ہیں ہم لوگ

محفل سوز و ساز ہے دنیا
حاصل سوز و ساز ہیں ہم لوگ

کوئی اس راز سے نہیں واقف
کیوں سراپا نیاز ہیں ہم لوگ

ہم کو رسوا نہ کر زمانے میں
بسکہ تیرا ہی راز ہیں ہم لوگ

سب اسی عشق کے کرشمے ہیں
ورنہ کیا اے مجازؔ ہیں ہم لوگ

غزل

خامشی کا تو نام ہوتا ہے ۔۔۔ ورنہ یوں بھی کلام ہوتا ہے
عشق کو پوچھتا نہیں کوئی ۔۔۔ حسن کا احترام ہوتا ہے
آنکھ سے آنکھ جب نہیں ملتی ۔۔۔ دل سے دل ہم کلام ہوتا ہے
حسن کو شرمسار کرنا ہے ۔۔۔ عشق کا انتقام ہوتا ہے

اللہ اللہ یہ نازِ حسنِ مجاز
انتظارِ سلام ہوتا ہے

غزل

ساقیٔ گلفام با صد اہتمام آ ہی گیا
نغمہ بر لب، خم بہ سر، بادہ بجام آ ہی گیا

اپنی نظروں میں نشاطِ جلوۂ خوباں لیے
خلوتیٔ خاص سوئے بزمِ عام آ ہی گیا

میری دُنیا جگمگا اُٹھی کسی کے نور سے
میرے گردوں پر مرا ماہِ تمام آ ہی گیا

جھوم جھوم اُٹھے شجر کلیوں نے آنکھیں کھول دیں
جانبِ گلشن کوئی مستِ خرام آ ہی گیا

پھر کسی کے سامنے چشمِ تمنا جھک گئی
شوق کی شوخی میں رنگِ احترام آ ہی گیا

میری شب اب میری شب ہے میرا بادہ میرا جام
وہ مرا سروِ رواں ماہ تمام آ ہی گیا

بارہا ایسا ہوا ہے یاد تک دل میں نہ تھی
بارہا مستی میں لب تک اس کا نام آ ہی گیا

زندگی کے خاکۂ سادہ کو رنگیں کر دیا
حسن کام آئے نہ آئے عشق کام آ ہی گیا

کھل گئی تھی صاف گردوں کی حقیقت اے مجازؔ
خیریت گذری کہ شاہیں زیرِ دام آ ہی گیا

غزل

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیِ وحشت کی قسم، حیرت کی قسم، حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

رودادِ غمِ اُلفت اُن سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے!
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہئے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ الفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی!
محفل تو تری سُونی نہ ہوئی کچھ اُٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اس محفلِ کیف و مستی میں اُس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

غزل

شوق کے ہاتھوں اے دلِ مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا
عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حسن بھی کیا رسوا ہوگا

حسن کی بزمِ خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدا ہوگا

چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا حاصل
درد کہ اپنی آپ دوا ہے تم سے اچھا کیا ہوگا

واعظِ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبےٰ کی باتیں
اس دنیا میں کیا رکھا ہے اُس دنیا میں کیا ہوگا

غزل

آسماں تک جو نالہ پہونچا ہے
دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے

میری نظروں میں حشر بھی کیا ہو
میں نے اس کا جلال دیکھا ہے

جلوۂ طور خوابِ موسےٰ ہے
کس نے دیکھا ہے کس کو دیکھا ہے

ہائے انجام اس سفینے کا
ناخدا نے جسے ڈبویا ہے

آہ کیا دل میں اب لہو بھی نہیں
آج اشکوں کا رنگ پھیکا ہے

جب بھی آنکھیں ملیں اُن آنکھوں سے
دل نے دل کا مزاج پوچھا ہے

وہ جوانی کہ تھی حریفِ طرب
آج بربادِ جام وصہبا ہے

کون اٹھ کر چلا ہے پہلو سے
جس طرف دیکھئے اندھیرا ہے

پھر مری آنکھ ہو گئی نمناک
پھر کسی نے مزاج پوچھا ہے

ان دنوں تو مجاز کی دنیا
"حُسن ہی حسن" کے سوا کیا ہے

غزالانِ لکھنؤ

فردوسِ حسن و عشق ہے دامانِ لکھنؤ
آنکھوں میں بس رہے ہیں غزالانِ لکھنؤ

تولے ہوئے ہے تیغ و سناں حسن بے نقاب
ناوک فگن ہے جلوۂ پنہانِ لکھنؤ

مطرب بھی ہے، شراب بھی، ابرِ بہار بھی
شیراز بن گیا ہے شبستانِ لکھنؤ

میری نوائے گرم سے معمور ہے فضا
برہم ہے مجھ سے صاحبِ دیوانِ لکھنؤ

"اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
وہ نو بہارِ ناز کہ ہے جانِ لکھنؤ
کچھ روز کا مسافر و مہماں ہوں اور کیا
کیوں بدگماں ہوں یوسفِ کنعانِ لکھنؤ"

قطعہ

کل تب کو ان میری شوخیِ گفتاری پہ حیرت تھا
یہ بادۂ گلرنگ تھا بے رنگ کہ سر تھا
سرور شوق تھی اور یا سدا رسم و آئین تھی
نوائے شوق تھی سرود و سرور مستی تھا کہ تماشائے غمزہ تھا

غزل

نگاہِ لطف مت اُٹھ خوگرِ آلام رہنے دے
ہمیں ناکام رہنا ہے ہمیں ناکام رہنے دے

کسی معصوم پر بیداد کا الزام کیا معنی
یہ وحشت خیز باتیں عشقِ بدانجام رہنے دے

ابھی رہنے دے دل میں شوقِ شوریدہ کے ہنگامے
ابھی سر میں محبّت کا جنونِ خام رہنے دے

ابھی رہنے دے کچھ دن لطفِ نغمہ مستیٔ صہبا
ابھی یہ ساز رہنے دے ابھی یہ جام رہنے دے

کہاں تک حُسن بھی آخر کرے پاسِ رواداری
اگر یہ عشق خود ہی فرقِ خاص و عام رہنے دے

غزل

رہِ شوق سے اب ہٹا چاہتا ہوں
کشش حُسن کی دیکھنا چاہتا ہوں

کوئی دل سا دردآشنا چاہتا ہوں
رہِ عشق میں رہنما چاہتا ہوں

تجھی سے تجھے چھینا چاہتا ہوں
یہ کیا چاہتا ہوں یہ کیا چاہتا ہوں

خطاؤں پہ جو مجھ کو مائل کرے پھر
سزا اور ایسی سزا چاہتا ہوں

وہ مخمور نظریں وہ مدہوش آنکھیں
خراب محبت ہوا چاہتا ہوں

وہ آنکھیں جھکیں وہ کوئی مسکرایا
پیام محبت سنا چاہتا ہوں

تجھے ڈھونڈھتا ہوں تری جستجو ہے
مزا ہے کہ خود گم ہوا چاہتا ہوں

یہ موجوں کی بیتابیاں کون دیکھے
میں ساحل سے اب لوٹنا چاہتا ہوں

کہاں کا کرم اور کیسی عنایت
مجازؔ اب جفا ہی جفا چاہتا ہوں

غزل

سازگار ہے ہمدم ان دنوں جہاں اپنا
عشق شادماں اپنا شوقِ کامراں اپنا

آہ بے اثر کس کی نالہ نارسا کس کا
کام بارہا آیا جذبۂ نہاں اپنا

کب کیا تھا اس دل پر حسن نے کرم اتنا
مہرباں اور اس درجہ کب تھا آسماں اپنا

اُلجھنوں سے گھبرائے میکدے میں در آئے
کس قدر تن آساں ہے ذوقِ رائیگاں اپنا

کچھ نہ پُوچھ اے ہمدم ان دنوں مرا عالم
مطربِ حسیں اپنا ساقیِ جواں اپنا
عشق اور رسوائی کون سی نئی شے ہے
عشق تو ازل سے تھا رسوائے جہاں اپنا
تم مجازؔ دیوانے مصلحت سے بیگانے
ورنہ ہم بنا لیتے تم کو رازداں اپنا

غزل

اذنِ خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم
ہٹ کر چلے ہیں رہگذرِ کارواں سے ہم

کیا پوچھتے ہو جھومتے آئے کہاں سے ہم
پی کر اُٹھے ہیں خمکدۂ آسماں سے ہم

کیوں کر ہوا ہے فاش زمانہ پہ کیا کہیں
وہ رازِ دل جو کہہ نہ سکے رازداں سے ہم

ہمدم یہی ہے رہگذرِ یارِ خوش خرام
گذرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھئے
اُلجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم

ہر نرگسِ جمیل نے مخمور کر دیا
پی کر اُٹھے شراب ہر اک بوستاں سے ہم
ٹھکرا دیئے ہیں عقل و خرد کے صنم کدے
گھبرا چکے تھے کشمکشِ امتحاں سے ہم
دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طرازِ شوق
لے سر اُٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم
بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جراٗتیں مجازؔ
ڈرتے نہیں سیاستِ اہلِ جہاں سے ہم

ساقی

مری مستی میں بھی اب ہوش ہی کا طور ہے ساقی
ترے ساغر میں یہ صہبا نہیں کچھ اور ہے ساقی

بھڑکتی جا رہی ہے دم بدم اک آگ سی دل میں
یہ کیسے جام ہیں ساقی، یہ کیسا دَور ہے ساقی

وہ شے دے جس سے نیند آ جائے عقلِ فتنہ پرور کو
کہ دل آزردۂ تمیزِ لطف و جور ہے ساقی

کہیں اک رند اور واماندۂ افکارِ تنہائی
کہیں محفل کی محفل طور سے بے طور ہے ساقی

جوانی اور یوں گھِر جائے طوفانِ حوادث میں
خدا رکھے ابھی تو بے خودی کا دَور ہے ساقی

چھلکتی ہے جو تیرے جام سے اُس مے کا کیا کہنا
ترے شاداب ہونٹوں کی مگر کچھ اور ہے ساقی

مجھے پینے دے۔ پینے دے کہ تیرے جامِ لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

غزل

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زُلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصوّر کیا کیجے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گُل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے، اب اُن کی جفا کو کیا کہیے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

غزل

مری وفا کا ترا لطف بھی جواب نہیں
مرے شباب کی قیمت ترا شباب نہیں

یہ ماہتاب نہیں ہے کہ آفتاب نہیں
سبھی ہے حسن، مگر عشق کا جواب نہیں

مری نگاہ میں جلوئے ہیں جلوے ہی جلوے
یہاں حجاب نہیں ہے یہاں نقاب نہیں

جنوں بھی حد سے سوا شوق بھی ہے حد سے سوا
یہ بات کیا ہے کہ میں موردِ عتاب نہیں

یہاں تو حسن کا دل ہے غم سے صد پارہ
میں کامیاب نہیں وہ بھی کامیاب نہیں

یہاں تو رات کی بیداریاں مسلّم ہیں
مگر وہاں بھی حسیں انکھڑیوں میں خواب نہیں

نہ پوچھئے مری دنیا کو میری دنیا میں
خود آفتاب بھی ذرہ ہے آفتاب نہیں

سبھی ہیں میکدۂ دہر میں خرد والے
کوئی خراب نہیں ہے کوئی خراب نہیں

مجازؔ کس کو میں سمجھاؤں کوئی کیا سمجھے
کہ کامیاب محبت بھی کامیاب نہیں

غزل

عقل کی سطح سے کچھ اور ابھر جانا تھا
عشق کو منزلِ پستی سے گزر جانا تھا

جلوے تھے حلقۂ ہر دامِ نظر سے باہر
میں نے ہر جلوے کو پابندِ نظر جانا تھا

حسن کا غم بھی حسیں، فکر حسیں، داد حسیں
ان کو ہر رنگ میں ہر طور سنور جانا تھا

حسن نے شوق کے ہنگامے تو دیکھے تھے بہت
عشق کے دعوۂ تقدیس سے ڈر جانا تھا

یہ تو کیا کہیے چلا تھا میں کہاں سے ہمدم
مجھ کو یہ بھی نہیں معلوم کدھر جانا تھا
حسن اور عشق کو دے طعنۂ بیداد مجاز
تم کو تو صرف اسی بات پہ مر جانا تھا

ایک شعر

عالمِ یاس میں کیا چیز ہے اک ساغرِ مے
وقت ظلمات میں جس طرح خضر کی قندیل

بول! اری او دھرتی بول!

بول! اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانوا ڈول

بادل بجلی رین اندھیاری دکھ کی ماری پرجا ساری
بچے بوڑھے سب دکھیا ہیں دکھیا نر ہیں دکھیا ناری
بستی بستی لوٹ مچی ہے سب بنیئے ہیں سب بیوپاری

بول! اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانوا ڈول

کلجگ میں جگ کے رکھوالے چاندی والے سونے والے
دیسی ہوں یا پردیسی ہوں نیلے پیلے گورے کالے
مکھی بھنگے بھن بھن کرتے ڈھونڈتے ہیں مکڑی کے جالے

بول اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانوڈول

کیا افرنگی کیا تاتاری آنکھ بچی اور برچھی ماری
کب تک جنتا کی بے چینی کب تک جنتا کی بیزاری
کب تک سرمائے کے دھندے کب تک یہ سرمایہ داری

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانوڈول

نامی اور مشہور نہیں ہم لیکن کیا مزدور نہیں ہم
دھوکا اور مزدوروں کو دیں ایسے تو مجبور نہیں ہم
منزل اپنے پاؤں کے نیچے منزل سے اب دور نہیں ہم

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانوڈول!

بول کہ تیری خدمت کی ہے　　بول کہ تیرا کام کیا ہے
بول کہ تیرے پھل کھائے ہیں　　بول کہ تیرا دودھ پیا ہے
بول کہ ہم نے حشر اٹھایا　　بول کہ ہم سے حشر اٹھا ہے
بول کہ ہم سے جاگی دنیا
بول کہ ہم سے جاگی دھرتی
بول! اری او دھرتی بول!　　راج سنگھاسن ڈانوڈول!

تاجِ وطن کا لعلِ درخشاں چلا گیا

(گاندھی جی کی موت سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

دردو غمِ حیات کا درماں چلا گیا
وہ خضرِ عصر و عیسٰیِ دوراں چلا گیا

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

رقصاں چلا گیا نہ غزل خواں چلا گیا
سوز و گداز و درد میں غلطیاں چلا گیا

برہم ہے زلفِ کفر، تو ایماں ہے سرنگوں
وہ فخرِ کفر و نازشِ ایماں چلا گیا

بیمارِ زندگی کی کرے کون دلدہی
نباض و چارہ سازِ مریضاں چلا گیا

کسی کی نظر پڑے گی اب "عصیاں" پہ لطف کی
وہ محرمِ نزاکتِ عصیاں چلا گیا

وہ رازدارِ محفلِ یاراں نہیں رہا
وہ غم گسارِ بزمِ حریفاں چلا گیا

اب کافری میں رسم و رہ دلبری نہیں
ایماں کی بات یہ ہے کہ ایماں چلا گیا

اک بے خودِ سرورِ دل و جاں نہیں رہا
اک عاشقِ صداقتِ پنہاں چلا گیا

با چشمِ نم ہے آج زلیخائے کائنات
زنداں شکن وہ یوسفِ زنداں چلا گیا

اے آرزو وہ چشمۂ حیواں نہ کر تلاش
ظلمات سے وہ چشمۂ حیواں چلا گیا

اب سنگ و خشت و خاک و خزف سربلند ہیں
تاجِ وطن کا لعلِ درخشاں چلا گیا

اب اہرمن کے ہاتھ میں ہے تیغِ خونچکاں
خوش ہے کہ دست و بازوئے یزداں چلا گیا

دیوِ بدی سے معرکہ سخت ہی سہی
یہ تو نہیں کہ روزِ جوانان چلا گیا

کیا اہلِ دل میں جذبۂ عشرت نہیں رہا
کیا عزمِ سرفروشیٔ مرداں چلا گیا

کیا باغیوں کی آتشِ دل سرد ہو گئی
کیا سرکشوں کا جذبۂ پنہاں چلا گیا

کیا وہ جنون و جذبۂ بیدار مر گیا
کیا وہ شبابِ حشر بداماں چلا گیا

خوش ہے بدی جو دام یہ نیکی پہ ڈال کے
رکھ دیں گے ہم بدی کا کلیجہ نکال کے

جشنِ آزادی

بہ صد غرور، بصد فخر و نازِ آزادی
مچل کے کھل گئی زلفِ درازِ آزادی
مہ و نجوم ہیں نغمہ طرازِ آزادی
وطن نے چھیڑا ہے اسطرح سازِ آزادی
زمانہ رقص میں زندگی غزلخواں ہے

(۲)

ہر اک جبیں پہ ہے اک موجِ نورِ آزادی
ہر ایک آنکھ میں کیف و سرورِ آزادی

غلامی خاک بسر ہے حضورِ آزادی
ہر ایک قصر ہے ایک بامِ طورِ آزادی
ہر ایک بام پہ ایک پرچمِ زر افشاں

(۳)

ہر ایک سمت نگاراں یاسمیں پیکر
نکل پڑے ہیں در و بام سے مہ و اختر
وہ سیلِ نور ہے خیرہ ہے آدمی کی نظر
بہ صد غرور و ادا خندہ زن ہے گردوں پر
زمینِ ہند کہ جولانگہِ غزالاں ہے

(۴)

صدائے دو انجم افلاک رقص فرمائیں
بتانِ کافر و سفاک رقص فرمائیں

شریکِ حلقہ اور اک رقص فرمائیں
طرب کا وقت ہے بیباک رقص فرمائیں
اب ایسے میں یہ تقاضائے بزمِ رنداں ہے

(۵)

ہے پاک ابرِ غلامی سے آسمانِ وطن
یہ کام کر گئے آخر بلاکشانِ وطن
ابھی تو خیر سے دہ چند ہوگی شانِ وطن
ابھی تو اور بھی مہکے گا بوستانِ وطن
کہ یہ بہار پیامی صد بہاراں ہے

(۶)

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں
یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں

وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں
ابھی وہ سعی جنوں خیز کامیاب نہیں
یہ انتہا نہیں، آغازِ کارِ مرداں ہے

دو شعر

وعدہ نہ کرو وعدہ باطل تو نہیں ہے
یہ باعث تسکین غم دل تو نہیں ہے
کیوں خوش ہے کوئی خستہ و واماندۂ طوفاں
یہ موج بلا ہے کوئی ساحل تو نہیں ہے

مجھے جانا ہے اک دن!

مجھے جانا ہے ایک دن تیری بزمِ ناز سے آخر
ابھی پھر درد ٹپکے گا مری آواز سے آخر
ابھی پھر آگ اُٹھے گی شکستہ ساز سے آخر

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو حسُن کے پیروں پہ ہے جبرِ حنا بندی
ابھی ہے عشق پر آئینِ فرسودہ کی پابندی
ابھی حاوی ہے عقل و روح پر جھوٹی خداوندی

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تہذیب عدل و حق کی کشتی کھے نہیں سکتی!
ابھی یہ زندگی دادِ صداقت دے نہیں سکتی!
ابھی انسانیت دولت سے ٹکرلے نہیں سکتی!
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو کائنات اوہام کا اک کارخانہ ہے!
ابھی دھوکا حقیقت ہے حقیقت اک فسانہ ہے
ابھی تو زندگی کو زندگی کر کے دکھانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی ہیں شہر کی تاریک گلیاں منتظر میری
ابھی ہے اک حسیں تحریکِ طوفاں منتظر میری
ابھی شاید ہے اک زنجیرِ زنداں منتظر میری
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو فاقہ کش انسان سے آنکھیں ملانا ہے
ابھی جھلسے ہوئے چہروں پہ اشکِ خوں بہانا ہے
ابھی پامالِ جورِ آدم کو سینے سے لگانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی ہر دشمنِ نظمِ کہن کا گیت گانا ہے
ابھی ہر لشکرِ ظلمت شکن کا گیت گانا ہے
ابھی خود سر فروشانِ وطن کا گیت گانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

کوئی دم میں حیاتِ نو کا پھر پرچم اٹھاتا ہوں
بایمائے حمیت جان کی بازی لگاتا ہوں
میں جاؤں گا میں جاؤنگا میں جاتا ہوں میں جاتا ہوں
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

آہنگِ نو

اے جوانانِ وطن رُوح جواں ہے تو اُٹھو
آنکھ اس محشرِ نو کی نگراں ہے تو اُٹھو
خوفِ بے حُرمتی و فکرِ زیاں ہے تو اُٹھو
پاسِ ناموسِ نگاراں جہاں ہے تو اُٹھو
اُٹھو نقارۂ افلاک بجا دو اُٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اُٹھ کر

ایک اک سمت سے شبخوں کی تیاری ہے
لطف کا وعدہ ہے اور مشقِ جفا کاری ہے

محفلِ زیست پہ فرمانِ قضا جاری ہے
شہر تو شہر ہے گاؤں پہ بھی بم باری ہے

یہ فضا میں جو گرجتے ہوئے طیارے ہیں
بر سرِ دوشِ ہوا موت کے ہرکارے ہیں

اُس طرف ہاتھوں میں شمشیریں ہی شمشیریں ہیں

اِس طرف ذہن میں تدبیریں ہی تدبیریں ہیں
ظلم پہ ظلم ہیں تعزیروں پہ تعزیریں ہیں
سر پہ تلوار ہے اور پاؤں میں زنجیریں ہیں

ایک ہو ایک کہ ہنگامۂ محشر ہے یہی!
عرصۂ زیست کا ہنگامۂ اکبر ہے یہی!

اپنی سرحد پہ جو اغیار چلے آتے ہیں
شعلہ افشاں و شرربار چلے آتے ہیں

خون پیتے ہوئے سرشار چلے آتے ہیں
تم جو اُٹھ جاؤ تو بے کار چلے آتے ہیں

خون جو بہہ نکلا ہے اُس خوں میں بہادوان کو
اُن کی کھودی ہوئی خندق میں گرادو ان کو

رنگِ گلہائے گلستانِ وطن تم سے ہے
شورشِ نعرۂ رندانِ وطن تم سے ہے
نشۂ نرگسِ خوبانِ وطن تم سے ہے
عفتِ ماہ جبینانِ وطن تم سے ہے

تم ہو غیرت کے امیں تم ہو شرافت کے امیں
اور یہ خطرے میں ہیں احساس تمہیں ہے کہ نہیں

یہ درندے یہ شرافت کے پرانے دشمن
تم کہ ہو حاملِ آدابِ روایاتِ کہن

جادہ پیما کے لیئے خضر ہو تم یہ رہزن
تم ہو خرمن کے نگہبان یہ برقِ خرمن

خطّۂ پاک میں زنہار نہ آنے پائیں!
آ ہی جائیں جو یہ زندہ تو نہ جانے پائیں!

مرد و زن پیر و جواں اُن کے مظالم کے شکار
خونِ معصوم میں ڈوبی ہوئی اُن کی تلوار
یہ قیامت کے ہوسناک غضب کے خوں خوار
اُن کے عصیاں کی نہ حد ہے نہ جرائم کا شمار

یہ ترحم سے نہ دیکھیں گے کسی کی جانب
اِن کی توپوں کے دہن کر دو انہی کی جانب

یہ تو ہیں فتنۂ بیدار دبا دو اِن کو
یہ مٹا دیں گے تمدن کو مٹا دو اِن کو

پھونک دو اِن کو جُھلس دو کہ جلا دو اِن کو
شانِ شایانِ وطن ہو یہ بتا دو اِن کو
یاد ہے تم کو کِن اسلاف کی تم یادیں ہو
تم تو خاؔلد کے پسر بھیؔم کی اولادیں ہو

تم تو تنہا بھی نہیں ہو کئی ہم ساز بھی ہیں
رؔوس کے مرد بھی ہیں چیںؔ کے جانباز بھی ہیں
کچھ نہ کچھ ساتھ فرنگی فسوں ساز بھی ہیں
اور ہم جیسے بہت زمزمہ پرداز بھی ہیں
دُور انسان کے سر سے یہ مصیبت کر دو
آگ دوزخ کی بُجھا دو اسے جنّت کر دو

خوابِ سحر

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر
رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر
عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا
دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا ہی رہا
اک نہ اک مذہب کی سعیِ خام بھی ہوتی رہی
اہلِ دل پر بارشِ الہام بھی ہوتی رہی
آسمانوں سے فرشتے بھی اُترتے ہی رہے
نیک بندے بھی خدا کا کام کرتے ہی رہے

ابنِ مریم بھی اُٹھے موسئ عمراں بھی اُٹھے
رام و گوتم بھی اُٹھے، فرعون و ہاماں بھی اُٹھے
اہلِ سیف اُٹھتے رہے اہلِ کتاب آتے رہے
ایں جناب اُٹھتے رہے اور آنجناب آتے رہے
حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی
ابرِ رحمت بن کے چھایا دہر پر اسلام بھی
مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے
مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے
آدمی منت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا
اِک نہ اِک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکّی میں پستی ہی رہی

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی
اہلِ باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے
یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتلِ عام
آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام
ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

مزدوروں کا گیت

محنت سے یہ مانا چور ہیں ہم   آرام سے کوسوں دور ہیں ہم
پر لڑنے پر مجبور ہیں ہم
مزدور ہیں ہم ! مزدور ہیں ہم

گو آفت و غم کے مارے ہیں   ہم خاک نہیں ہیں تارے ہیں
اس جگ کے راج دلارے ہیں

مزدور ہیں ہم ! مزدور ہیں ہم

بننے کی تمنا رکھتے ہیں   مٹنے کا کلیجہ رکھتے ہیں
سرکش ہیں سر اونچا رکھتے ہیں

مزدور ہیں ہم ! مزدور ہیں ہم

گو آج بھی ہیں ادبار میں ہم کہتے ہیں کھلے بازار میں ہم
ہیں سب سے بڑے سنسار میں ہم
مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

جس سمت بڑھا دیتے ہیں قدم جھک جاتے ہیں شاہی پرچم
ساونت ہیں ہم بلونت ہیں ہم
مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

گو جان پہ لاکھوں بار بنی! کر گزرے مگر جو جی میں ٹھنی
ہم دل کے کھرے باتوں کے دھنی
مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

ہم کیا ہیں کبھی دکھلا دیں گے ہم نظمِ کہن کو ڈھا دیں گے
ہم ارض و سما کو ہلا دیں گے
مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

ہم جسم میں طاقت رکھتے ہیں   سینوں میں حرارت رکھتے ہیں
ہم عزمِ بغاوت رکھتے ہیں

مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

جس روز بغاوت کر دیں گے   دنیا میں قیامت کر دیں گے
خوابوں کو حقیقت کر دیں گے

مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

ہم قبضہ کریں گے دفتر پر   ہم وار کریں گے قیصر پر
ہم ٹوٹ پڑیں گے لشکر پر!

مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم!

مسافر

مسافر یونہی گیت گائے چلا جا　　سرِ رہ گزر کچھ سنائے چلا جا
تری زندگی سوز و سازِ محبّت　　ہنسائے چلا جا رلائے چلا جا
تجھے راستے میں خنک بھی تپاں بھی　　لگائے چلا جا. بجھائے چلا جا
کوئی لاکھ روکے کوئی لاکھ ٹوکے　　قدم اپنے آگے بڑھائے چلا جا
حسیں بھی تجھے راستے میں ملیں گے　　نظر مت ملا، مسکرائے چلا جا
محبت کے نقشے تمنّا کے خاکے　　بنائے چلا جا، مٹائے چلا جا
قدامت حدیں کھینچتی ہی رہے گی　　قدامت کی بنیاد ڈھائے چلا جا
قسم شوق کی فطرتِ مضطرب کی　　یونہی نت نئی دھن میں گائے چلا جا

جو پرچم اُٹھا ہی لیا سرکشی کا!
اسے آسماں تک اُڑائے چلا جا

نوجوان سے

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اُٹھے وہ شباب پیدا کر
ترے خرام میں ہے زلزلوں کا رازِ نہاں
ہر ایک گام پر اک انقلاب پیدا کر
صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ
تو سنگ و خشت سے چنگ و رباب پیدا کر
بہت لطیف ہے اے دوست تیغ کا بوسہ
یہی ہے جانِ جہاں اس میں آب پیدا کر

ترے قدم پہ نظر آئے محفلِ انجم
وہ بانکپن وہ اچھوتا شباب پیدا کر
ترا شباب امانت ہے ساری دنیا کی
تو خارزارِ جہاں میں گلاب پیدا کر
سکون خواب ہے بیدست و پا ضعیفی کا
تو اضطراب ہے خود اضطراب پیدا کر
نہ دیکھ زہد کی تو عصمت گنہ آلود
گنہ میں فطرتِ عصمت مآب پیدا کر
ترے جلو میں نئی جنتیں نئے دوزخ
نئی جزائیں انوکھے عذاب پیدا کر
شراب کھینچی ہے سب نے غریب کے خوں سے
تو اب امیر کے خوں سے شراب پیدا کر

گرا دے قصرِ تمدّن کہ اک فریب ہے یہ
اُٹھا دے رسمِ محبت، عذاب پیدا کر
جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر
بہے زمیں پہ جو میرا لہو تو غم مت کر
اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

نوجوان خاتون سے

حجابِ فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حُسن کو پردا بنا لیتی تو اچھا تھا

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا

تری چینِ جبیں خود اک سزا قانونِ فطرت میں
اسی شمشیر سے کارِ سزا لیتی تو اچھا تھا

یہ تیرا زرد رُخ، یہ خشک لب، یہ وہم، یہ وحشت
تو اپنے سر سے یہ بادل ہٹا لیتی تو اچھا تھا

دلِ مجروح کو مجروح تر کرنے سے کیا حاصل
تو آنسو پونچھ کر اب مسکرا لیتی تو اچھا تھا

ترے زیرِ نگیں گھر ہو، محل ہو، قصر ہو، کچھ ہو
میں یہ کہتا ہوں تو ارض و سما لیتی تو اچھا تھا

اگر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل!
بھری محفل میں آ کر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارہ ہے
اگر تو سازِ بیداری اُٹھا لیتی تو اچھا تھا

عیاں ہیں دشمنوں کے خنجروں پر خون کے دھبے
انھیں تو رنگِ عارض سے ملا لیتی تو اچھا تھا

سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اُٹھا لیتی تو اچھا تھا

اثر باقی نہیں مفلوج پیروں کی دعاؤں میں
جوانانِ بلاکش کی دعا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

پردہ اور عصمت

جو ظاہر نہ ہو وہ لطافت نہیں ہے
جو پنہاں رہے وہ صداقت نہیں ہے
یہ فطرت نہیں ہے مشیّت نہیں ہے
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

صبا اور گلستاں سے دامن کشیدہ
نوائے فسوں خیز اور ناشنیدہ
تجلیِ رُخسار اور نادمیدہ
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

سرِ رہگذر چھُپ چھپا کر گزرنا
خود اپنے ہی جذبات کا خون کرنا
حجابوں میں جینا، حجابوں میں مرنا
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

خیالاتِ بیہم میں ہر وقت گُم سُم
دلِ نرم و نازک پہ ابرِ توہّم
بُجھا سا تبسم گھٹا سا تکلّم
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

وہ اِک کاہشِ تلخ ہر آن دل میں
وہ شام و سحر ایک خلجان دل میں
اُمنڈتا ہوا ایک طوفان دل میں
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

نگاہوں کی دعوت کو پامال کرنا
مذاقِ لطافت کو پامال کرنا
تقاضائے فطرت کو پامال کرنا
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے
قسم انجمِ شب کے ذوقِ سفر کی
قسم تازگیٔ نسیمِ سحر کی
قسم آسمانوں کے شمس و قمر کی
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے
قسم شوخیٔ عشقِ سنجوگتا کی
قسم جوَن کے عزمِ صبر آزما کی
قسم طاہرہ کی، قسم خالدہ کی
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصوّر، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلا کا عمامہ ، جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی ، جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں ، اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اِک ستارہ ، پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہُوک سی سینے میں اُٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دِل کیا کروں ، اے وحشتِ دِل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر چلتی ہوئی شمشیر سی
اے غمِ دل کیا کروں ، اے وحشتِ دِل کیا کروں

راستے میں رُک کے دم لوں یہ مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مِل جائے یہ قسمت نہیں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل!
پھر کسی شہنازِ لالہ رُخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لئے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لیے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لئے

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں ٹھانی ہے کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں
اُن کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیرِ ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مُردہ چاند تارے نوچ لوں
اِس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونکدوں
اس کا گلشن پھونکدوں اُس کا شبستاں پھونکدوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونکدوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

خانہ بدوش

بستی سے تھوڑی دُور چٹانوں کے درمیاں
ٹھہرا ہوا ہے خانہ بدوشوں کا کارواں
ان کی کہیں زمین نہ ان کا کہیں مکاں!
پھرتے ہیں یونہی شام و سحر زیرِ آسماں
دھوپ اور ابر و باد کے مارے ہوئے غریب
یہ لوگ وہ ہیں جن کو غلامی نہیں نصیب
اس کارواں میں طفل بھی ہیں نوجواں بھی ہیں
بوڑھے بھی ہیں مریض بھی ہیں ناتواں بھی ہیں

میلے پھٹے لباس میں کچھ دیویاں بھی ہیں
سب زندگی سے تنگ بھی ہیں سرگراں بھی ہیں
بیزار زندگی سے ہیں پیر و جواں سبھی!
الطافِ شہریار کے ہیں نوحہ خواں سبھی!
ماتھوں پہ سخت کوششِ پیہم کی داستاں
آنکھوں میں حزن و یاس کی گھنگھور بدلیاں
چہروں پہ تازیانۂ افلاس کے نشاں!
ہر ہر ادا سے بھوک کی بیتابیاں عیاں
پیسہ اگر ملے تو حمیت بھی بیچ دیں
روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں
اُٹھے ہیں جس کی گود سے آزردہ قوم ہے
توڑے ہیں جس نے چرخ سے اختر وہ قوم ہے

پلٹے ہیں جس نے دہر کے دفتر وہ قوم ہے
پیدا کیے ہیں جس نے پیمبر وہ قوم ہے
اب کیوں شریکِ حلقۂ نوعِ بشر نہیں
انساں ہیں آخرش یہ کوئی جانور نہیں
آخر زمانہ اِن کو ستائے گا کب تلک؟
کب سے جلا رہا ہے جلائے گا کب تلک؟
کب سے مٹا رہا ہے مٹائے گا کب تلک؟
ان کے لہو کو جوش نہ آئے گا کب تلک؟
مایوسیوں کی تہ میں جنوں خیزیاں بھی ہیں
افلاس کی سرشت میں خونریزیاں بھی ہیں

سرمایہ داری

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمھیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے
یہ وہ آندھی ہے جس کی رو میں مفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے
یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے
یہ انسانی بلا خود خونِ انسانی کی گاہک ہے
وبا سے بڑھ کے مہلک، موت سے بڑھ کر بھیانک ہے

نہ دیکھے ہیں بُرے اِس نے نہ پرکھے ہیں بھلے اِس نے
شکنجوں میں جکڑ کر گھونٹ ڈالے ہیں گلے اِس نے

بلائے بے اماں ہے طور ہی اس کے نرالے ہیں
کہ اِس نے غیظ میں اُجڑے ہوئے گھر پھونک ڈالے ہیں

قیامت اِسکے غمزے، جان لیوا ہیں ستم اِس کے
ہمیشہ سینۂ مفلس پہ پڑتے ہیں قدم اس کے

کہیں یہ خوں سے فردِ مال و زر تحریر کرتی ہے
کہیں یہ ہڈیاں چُن کر محل تعمیر کرتی ہے

غریبوں کا مقدس خون پی پی کر بہکتی ہے
محل میں ناچتی ہے رقص گاہوں میں تھرکتی ہے

بظاہر چند فرعونوں کا دامن بھر دیا اس نے
مگر گُلزارِ عالم کو جہنم کر دیا اس نے

درندے سر جھکا دیتے ہیں لوہا مان کر اس کا
نظر سفاک تر اس کی نفس مکروہ تر اس کا
جدھر چلتی ہے بربادی کے ساماں ساتھ چلتے ہیں
نحوست ہمسفر ہوتی ہے شیطاں ساتھ چلتے ہیں
یہ اکثر ٹوٹ کر معصوم انسانوں کو راہوں میں
خدا کے زمزمے گاتی ہے چھپ کر خانقاہوں میں
جواں مردوں کے ہاتھوں سے یہ نیزے چھین لیتی ہے
یہ ڈائن ہے بھری گودوں سے بچے چھین لیتی ہے
یہ غیرت چھین لیتی ہے حمیت چھین لیتی ہے
یہ انسانوں سے انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہے
یہ آشوب ہلاکت، فتنۂ اسکندر و دارا
زمیں کے دیوتاؤں کی کنیز انجمن آرا

ہمیشہ خون پی کر ہڈیوں کے رتھ میں چلتی ہے

زمانہ چیخ اٹھتا ہے یہ جب پہلو بدلتی ہے

گرجتی گونجتی یہ آج بھی میداں میں آتی ہے

مگر بدمست ہے ہر ہر قدم پر لڑکھڑاتی ہے

مبارک دوستو لبریز ہے اب اس کا پیمانہ

اُٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیادِ کاشانہ

انقلاب

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ پیچھا چھوڑ دے
کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے

تیری تانوں میں ہے ظالم کس قیامت کا اثر
بجلیاں سی گر رہی ہیں خرمنِ ادراک پر

یہ خیال آتا ہے رہ رہ کر دلِ بیتاب میں
بہہ نہ جاؤں پھر ترے نغمات کے سیلاب میں

چھوڑ کر آیا ہوں کس مشکل سے میں جام و سبو
آہ کس دل سے کیا ہے میں نے خونِ آرزو

پھر شبستانِ طرب کی راہ دکھلاتا ہے تو
مجھ کو کرنا چاہتا ہے پھر خراب رنگ و بو
میں نے مانا وجد میں دُنیا کو لا سکتا ہے تو
میں نے یہ مانا غمِ ہستی مٹا سکتا ہے تو
میں نے مانا تیری موسیقی ہے اتنی پُر اثر
جھوم اُٹھتے ہیں فرشتے تک ترے نغمات پر
ہاں یہ سچ ہے زمزمے تیرے مچاتے ہیں وہ دھوم
جھوم جاتے ہیں مناظر، رقص کرتے ہیں نجوم
تیرے ہی نغمے سے وابستہ نشاطِ زندگی
تیرے ہی نغمے سے کیف و انبساطِ زندگی
تیری صوتِ سرمدی باغِ تصوف کی بہار
تیرے ہی نغموں سے بیخود عابدِ شب زندہ دار

بلبلیں نغمہ سرا ہیں تیری ہی تقلید میں
تیرے ہی نغموں سے دھومیں محفلِ ناہید میں
مجھ کو تیرے سحرِ موسیقی سے کب انکار ہے
مجھ کو تیرے لحنِ داؤدی سے کب انکار ہے
بزمِ ہستی کا مگر کیا رنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
ہر زباں پر اب صلائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
فرشِ گیتی سے سکوں اب مائلِ پرواز ہے
ابر کے پردوں میں سازِ جنگ کی آواز ہے
پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اُٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب
آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے

کوہ و صحرا میں زمیں سے خون اُبلے گا ابھی
رنگ کے بدلے گلوں سے خون ٹپکے گا ابھی
بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور دَرّاتے ہوئے
اک جنوں انگیز لَے میں جانے کیا گاتے ہوئے
سرکشی کی تُند آندھی دم بدم چڑھتی ہوئی
ہر طرف یلغار کرتی ہر طرف بڑھتی ہوئی
بھوک کے مارے ہوئے انساں کی فریادوں کے ساتھ
فاقہ مستوں کے جلو میں خانہ بربادوں کے ساتھ
ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوشِ انتقام
گر پڑیں گے خوف سے ایوانِ عشرت کے ستوں
خون بن جائے گی شیشوں میں شرابِ لالہ گوں

خون کی بُو لے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی
خون ہی خوں ہو گا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی
جھونپڑوں میں خوں محل میں خوں شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں
پُرسکوں صحرا میں خوں، بیتاب دریاؤں میں خوں
دیر میں خوں مسجدوں میں خوں کلیساؤں میں خوں
خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں
ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں
خون کی رنگینیوں میں ڈوب جائے گی بہار
ریگِ صحرا پر نظر آئیں گے لاکھوں لالہ زار
خون سے رنگیں فضائے بوستاں ہو جائے گی
نرگسِ مخمور چشمِ خوں فشاں ہو جائے گی!

کوہساروں کی طرف سے "سرخ آندھی" آئے گی
جا بجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی
توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں سے اسیر
بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں میں فقیر
حشر در آغوش ہو جائے گی دُنیا کی فضا
دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا
سُرخ ہونگے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام
غرق ہوں گے آتشیں ملبوس میں منظر تمام
اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق
آسماں پر خاک ہوگی، فرش پر رنگِ شفق
اور اِس رنگِ شفق میں باہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

ہمارا جھنڈا

شیر ہیں چلتے ہیں دراتے ہوئے بادلوں کی طرح منڈلاتے ہوئے
زندگی کی راگنی گاتے ہوئے
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

ہاں یہ سچ ہے بھوک سے حیران ہیں پر یہ مت سمجھو کہ ہم بے جان ہیں
اِس بری حالت میں بھی طوفاں ہیں
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

ہم وہ ہیں جو بیرخی کرتے نہیں ہم وہ ہیں جو موت سے ڈرتے نہیں
ہم وہ ہیں جو مر کے بھی مرتے نہیں
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

چین سے محلوں میں ہم رہتے نہیں   عیش کی گنگا میں ہم بہتے نہیں
بھید دشمن سے کبھی کہتے نہیں

آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

جانتے ہیں ایک لشکر آئے گا!   توپ دکھلا کر ہمیں دھمکائے گا
پر یہ جھنڈا ابھی یونہی لہرائے گا

آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

کب بھلا دھمکی سے گھبراتے ہیں ہم   دل میں جو ہوتا ہے کہہ جاتے ہیں ہم
آسماں ہلتا ہے، جب گاتے ہیں ہم

آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

لاکھ لشکر آئیں کب ہلتے ہیں ہم   آندھیوں میں جنگ کی کھلتے ہیں ہم
موت سے ہنس کر گلے ملتے ہیں ہم

آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

غدّار

یار بچ کر چل کہ یہ غدار ہے   تو سمجھتا ہے کہ یہ بھی یار ہے
آستیں میں اسکی اک تلوار ہے
یار بچ کر چل کہ یہ غدار ہے

نیک بخت و نیک سیرت نیک خو   نرم لہجہ اور میٹھی گفتگو!
کل یہی پی جائے گا تیرا لہو
یار بچ کر چل کہ یہ غدار ہے

عمر بھر یہ قیمتیں پھوڑا کیا   اپنا رشتہ غیر سے جوڑا کیا
دشمنوں کی روٹیاں توڑا کیا
یار بچ کر چل کہ یہ غدّار ہے

جب بُرائی پر کمر کستا ہے یہ   ہر جگہ ہر شہر میں بستا ہے یہ
ایک ناگن کی طرح ڈستا ہے یہ
یار بچ کر چل کہ یہ غدّار ہے
دیکھ میں کہتا ہوں اب بھی مان لے   آہ مشکل ہے کہ تو پہچان لے
یہ ترا دشمن ہے اب بھی جان لے
یار بچ کر چل کہ یہ غدّار ہے
جب زمیں کیا آسماں تھرّائے گا   جب لڑائی کا بگل بج جائے گا
تُو اسے اپنے مقابل پائے گا
یار بچ کر چل کہ یہ غدّار ہے

مزارِ رہنما

برمزار ڈاکٹر انصاری مرحوم

مُغنیِ ربابِ دلِ اہلِ نظر بھی نہاں ہے سنگ پاروں میں گہر بھی
جمالِ قوم بھی صاحب نظر بھی مسافر بھی خضر بھی چارہ گر بھی

خنک اور مرمریں مدفن میں پنہاں خروشِ برق و طوفانِ شرر بھی
سکونِ دیر۔ تقدیسِ کلیسا گدازِ اُمتِ خیر البشر بھی

یہ تربت ہے امیرِ کارواں کی
یہ منزل بھی ہے شمعِ رہ گزر بھی

ایک جلاوطن کی واپسی

پھر خبر گرم ہے وہ جانِ وطن آتا ہے
پھر وہ زندانیٔ زندانِ وطن آتا ہے
وہ خرابِ گل و ریحانِ وطن آتا ہے
مصر سے یوسفِ کنعانِ وطن آتا ہے
"کوئی معشوق بصد شوکت و ناز آتا ہے
سرخ بیرق ہے سمندر میں جہاز آتا ہے"
رندِ بے کیف کو تھی بادہ و ساغر کی تلاش
ناظرِ منظرِ فطرت کو تھی منظر کی تلاش

ایک بھونرے کو خزاں میں تھی گلِ تر کی تلاش
خود صنم خانۂ آذر کو تھی آذر کی تلاش

مژدہ اے دوست کہ وہ جانِ بہار آ پہنچا!
اپنے دامن میں لئے برق و شرار آ پہنچا

اپنا پرچم کچھ اس انداز سے لہراتا ہے
رنگ اغیار کے چہروں سے اُڑا جاتا ہے

کوئی شاداں، کوئی حیراں، کوئی شرماتا ہے
کون یہ ساحلِ مشرق پہ نظر آتا ہے

اپنے میخانے کا اک میکش بیحال ہے یہ
ہاں وہی مردِ جواں بخت و جواں سال ہے یہ

مردِ سرکش تجھے آدم کی کہانی کی قسم
رُوحِ انساں کے تقاضائے نہانی کی قسم

جذبۂ عیش کی ہر شورشِ فانی کی قسم
تجھ کو اپنی اُسی بدمست جوانی کی قسم
آکہ اک بار گلے سے تو لگالیں تجھ کو
اپنے آغوشِ محبت میں اُٹھالیں تجھ کو
نطق تو اب بھی ہے، پر شعلہ فشاں ہے کہ نہیں
سوزِ پنہاں سے تری رُوح تپاں ہے کہ نہیں
تجھ پہ یہ بارِ غلامی کا گراں ہے کہ نہیں
جسم میں خون جوانی کا رواں ہے کہ نہیں
اور اگر ہے تو پھر آ تیرے پرستار ہیں ہم
جنسِ آزادیٔ انساں کے خریدار ہیں ہم
ساقی و رند ترے ہیں، مے گلفام تری
اُٹھ کہ آسودہ ہے پھر حسرتِ ناکام تری

برہمن تیرے ہیں کل ملتِ اسلام تری
صبحِ کاشی تری ہنگم کی حسیں شام تری

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اُٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

دیکھ بدلا نظر آتا ہے گلستاں کا سماں
ساغر و ساز نہ لے، جنگ کے نعرے ہیں یہاں

یہ دعائیں ہیں وہ مظلوم کی آہوں کا دھواں
مائلِ جنگ نظر آتا ہے ہر مرد جواں

سر فروشانِ بلاکش کا سہارا بن جا
اُٹھ اور افلاکِ بغاوت کا ستارا بن جا

بدیشی مہمان سے

مسافر بھاگ وقتِ بے کسی ہے
ترے سر پر اجل منڈلا رہی ہے
تری جیبوں میں ہیں سونے کے توڑے
یہاں ہر جیب خالی ہو چکی ہے
یہ عالم ہو گیا ہے مفلسی کا!
کہ رسمِ میزبانی اُٹھ گئی ہے
نہ دے ظالم فریب چارہ سازی
یہ بستی تجھ سے اب تنگ آ چکی ہے

مناسب ہے کہ اپنا راستہ لے
وہ کشتی دیکھ ساحل سے لگی ہے

گھٹا جو اس سمندر سے اُٹھی ہے
دُرِ خوش آب بھی برسا چکی ہے

مگر اب اس کا عالم ہی جُدا ہے
یہ بدلی آگ برساتی اُٹھی ہے

ستارہ صبح کا بے نُور ہے اب
درو دیوار پر دھوپ آ چکی ہے

نسیمِ نرم رو اس گلستاں کی
سمومِ دشت پیما بن چکی ہے

بگولے اُٹھ رہے ہیں بڑھ رہے ہیں
فضائے دہر میں ہلچل مچی ہے

یہاں ہر شاخ شمشیرِ برہنہ
گلوں سے خون کی بُو آ رہی ہے
مرتّب اک نیا دستور ہوگا
بِنا اک دورِ نو کی پڑ رہی ہے
ہلی جاتی ہے بنیادِ قیامت
جوانی ہوش میں آئی ہوئی ہے
یہاں کے آسمانِ آتشیں پر
بغاوت کی گھٹا منڈلا رہی ہے
یہاں سے ایک طوفاں چل رہا ہے
یہاں سے ایک آندھی اُٹھ رہی ہے

اِدھر بھی آ

یہ جہد و کشمکش یہ خروشِ جہاں بھی دیکھ
ادبار کی، سروں پہ گھنی بدلیاں بھی دیکھ
یہ توپ یہ تفنگ یہ تیغ و سناں بھی دیکھ
او کشتۂ نگارِ دل آرا اِدھر بھی آ

آ، اور بگل کا نغمۂ "جاں آفریں" بھی سُن
آ، بےکسوں کا نالہ اندوہگیں بھی سُن
آ، باغیوں کا زمزمۂ آتشیں بھی سُن
او مستِ ساز و بربط و نغمہ اِدھر بھی آ

تقدیر کچھ ہو، کاوشِ تدبیر بھی تو ہے
تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے
آ منتظر ہے عشرتِ فردا ادھر بھی آ

اندھیری رات کا مسافر!

جوانی کی اندھیری رات ہے ظلمت کا طوفاں ہے
مری راہوں سے نورِ ماہ و انجم تک گریزاں ہے
خدا سویا ہوا ہے، اہرمن محشر بداماں ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

غم و حرماں کی یورش ہے مصائب کی گھٹائیں ہیں
جنوں کی فتنہ خیزی حسن کی خونیں ادائیں ہیں
بڑی پُر زور آندھی ہے، بڑی کافر بلائیں ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فضا میں موت کے تاریک سائے تھرتھراتے ہیں
ہوا کے سرد جھونکے قلب پر خنجر چلاتے ہیں
گزشتہ عشرتوں کے خواب آئینہ دکھاتے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

زمیں چیں بر جبیں ہے آسماں تخریب پر مائل
رفیقانِ سفر میں کوئی بسمل ہے، کوئی گھائل
تعاقب میں لٹیرے ہیں، چٹانیں راہ میں حائل
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

افق پر زندگی کے لشکرِ ظلمت کا ڈیرا ہے
حوادث کے قیامت خیز طوفانوں نے گھیرا ہے
جہاں تک دیکھ سکتا ہوں اندھیرا ہی اندھیرا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

چراغِ دیر، فانوسِ حرم، قندیلِ رہبانی
یہ سب ہیں مدتوں سے بے نیازِ نورِ عرفانی
نہ ناقوسِ برہمن ہے، نہ آہنگِ حدی خوانی
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

تلاطم خیز دریا، آگ کے میدان حائل ہیں
گرجتی آندھیاں، بپھرے ہوئے طوفان حائل ہیں
تباہی کے فرشتے جبر کے شیطان حائل ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فضا میں شعلہ افشاں دیوِ استبداد کا خنجر
سیاست کی سنانیں اہلِ زر کے خونچکاں تیور
فریبِ بیخودی دیتے ہوئے بلور کے ساغر
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

بدی پر بارشِ لطف و کرم نیکی پہ تعزیریں
جوانی کے حسیں خوابوں کی ہیبت ناک تعبیریں
نکیلی تیز سنگینیں ہیں، خوں آشام شمشیریں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

حکومت کے مظاہر جنگ کے پُر ہول نقشے ہیں
کدالوں کے مقابل توپ، بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل تازیانے، بیڑیاں پھانسی کے تختے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

اُفق پر جنگ کا خونیں ستارہ جگمگاتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلبِ گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فنا کے آہنی وحشت اثر قدموں کی آہٹ ہے
دھوئیں کی بدلیاں ہیں گولیوں کی سنسناہٹ ہے
اجل کے قہقہے ہیں زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

غزل

نہیں یہ فکر کوئی رہبر کامل نہیں ملتا
کوئی دنیا میں مانوس مزاج دل نہیں ملتا

یہ آنا کوئی آنا ہے کہ بس رسماً چلے آئے
یہ ملنا خاک ملنا ہے کہ دل سے دل نہیں ملتا

کبھی ساحل پہ رہ کر شوق طوفانوں سے ٹکرائیں
کبھی طوفاں میں گھر کر فکر ہے ساحل نہیں ملتا

شکستہ پا کو مژدہ خستگان راہ کو مژدہ
کہ رہبر کو سراغ جادۂ منزل نہیں ملتا

وہاں کتنوں کو تخت و تاج کا ارماں ہے کیا کہیے
جہاں سائل کو اکثر کاسۂ سائل نہیں ملتا

یہ قتل عام اور بے اذن قتل عام کیا معنی
یہ بسمل کیسے بسمل ہیں جنھیں قاتل نہیں ملتا

آج

کارفرما پھر مرا ذوقِ غزلخوانی ہے آج
ہر نفس کا ساز گرمِ شعلہ افشانی ہے آج

پھر نگاہِ شوق کی گرمی ہے اور روئے نگار
پھر عرق آلود اک کافر کی پیشانی ہے آج

پھر ادھر لب پر قصیدے ہیں لب و رخسار کے
پھر ادھر چہرے پہ تابانی سی تابانی ہے آج

حسن اس درجہ نشاطِ حسن میں ڈوبا ہوا
انکھڑیاں بے خود، شمیمِ زلف دیوانی ہے آج

لرزشِ لب میں شراب و شعر کا طوفان ہے
جنبشِ مژگاں میں افسونِ غزلخوانی ہے آج

وہ نفس کی زمزمہ سنجی، نظر کی گفتگو
سینۂ معصوم میں اک طرفہ طغیانی ہے آج
یاں بایں عالم غرورِ یوسفیت بھی نہیں
واں زلیخائی بہ عزمِ چاک دامانی ہے آج
واں اشارے ہیں بہک جانا ہی عینِ ہوش ہے
ہوش میں رہنا یقیناً سخت نادانی ہے آج
وہ لبوں کی آرزو، سینے کی سرکش آرزو
کس قدر آزاد ان زلفوں کا زندانی ہے آج
کشمکش سی کشمکش ہے ہر مذاقِ عاشقی
کامراں سی کامراں ہر سعیِ امکانی ہے آج
حسن کے چہرے پہ ہے نورِ صداقت کی دمک
عشق کے سر پر کلاہ فخرِ انسانی ہے آج
شوق سے موقع شناسی کی توقع بھی غلط
میں نے ان کی شکل بھی مشکل سے پہچانی ہے آج

غزل

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

تقاضے کیوں کروں پیہم نہ ساقی
کسے یاں فکرِ بیش و کم نہیں ہے

مری بربادیوں کا ہم نشینو
تمھیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

ابھی بزمِ طرب سے کیا اٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے

بایں سیلِ غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مجازؔ اک بادہ کش تو ہے یقیناً
جو ہم سنتے تھے وہ عالم نہیں ہے

مسکراہٹیں

شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا
تازہ ترین مجموعہ جسمیں ایسے
مضامین شامل ہیں جو آجتک انکی
کسی کتاب میں شائع نہیں ہوئے
اگر آپ کشاکش حیات سے پریشان ہوکر
چند لمحے مسکرانا چاہتے ہوں تو
مسکراہٹیں ملاحظہ فرمائیے —

قیمت مجلد دو روپیہ

کتابی دنیا
لکھنؤ